یہ تحفۂ شیراز ہم ہندیوں کے لیے قند پارسی کی لذت رکھتا ہے۔

اپنی موج میں - از جناب آوارہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۰ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ: آوارہ، فروغ اردو، امین آباد پارک، لکھنؤ۔

اردو زبان کے چٹخاروں کے لذت آشنا جناب آوارہ کے خوانِ ادب سے ناواقف نہیں ہیں، "اپنی موج میں" اُن کے ان مضامین اور تقریروں کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے ہماری قدیم تہذیب کی بعض دلچسپ یادگاروں کے جن کا ذکر اب صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، مزاحیہ انداز میں ایسے دلکش مرقعے دکھائے ہیں کہ ان کے لطف زبان اور حسن بیان پر ذوق سلیم وجد کرنے لگتا ہے، اور اس کے لیے انھوں نے بگڑے رئیس، مصاحب، بٹیر باز، کبوتر باز، مرغ باز، بانکے، مشاطہ، مغلانی، بھٹیاری، پنڈت جی، لالہ جی، جوتشی وغیرہ جیسے کردار منتخب کیے ہیں، جن سے بہتر ان رخوں کی مصوری نہیں ہو سکتی، اور ان ہی کی زبان، محاورے، روزمرہ اور ان ہی کے آداب و تہذیب میں، ان کا ایسا دلچسپ خاکہ کھینچا ہے، اور اپنے حسن بیان سے ان میں ایسا رنگ بھر دیا ہے کہ ان کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آجاتی ہیں، مولانا عبدالماجد صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "زبان کے محاورات پر یہ عبور، ادب کے نوک پلک پر یہ قدرت، ہر فن اور ہر پیشہ کے تلازموں، اصطلاحوں اور استعاروں پر بے تکلف حکومت وصاحبقرانی کی یہ دولت شاید ہی کسی خوش نصیب کے نصیب میں آئی ہو"، اس زبان کو لکھنے والے کیا کچھ دنوں میں اس سے لطف اٹھانے والے بھی مشکل سے نظر آئیں گے، مصنف نے اپنے زور قلم سے ان یادگاروں کو جن کا ذکر اب صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، زندہ کر دیا، اردو میں یہ کتاب بڑا قیمتی اضافہ ہے۔

گلدستۂ طہارت - از جناب مولوی غلام مصطفی صاحب عثمانی گیاوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، قیمت مجلد عمر، پتہ: مولف لیک روڈ رانچی سے ملے گی۔

اس رسالہ میں طہارت کی اہمیت اور وضو، غسل، تیمم اور پانی کی طہارت کے احکام و مسائل بیان کیے گئے ہیں، رسالہ مختصر مگر جامع ہے۔

"م"

جلد ۷۵ ۔۔۔ ماہ رجب المرجب ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۵۵ء ۔۔۔ عدد ۳

مضامین

شذرات

اردو کو مٹانے اور ہندی کو بڑھانے کے لیے جن جن تدبیروں سے کام لیا جا رہا ہے اس کا ایک دلچسپ نمونہ گذشتہ
مردم شماری کی رپورٹ کے لسانیاتی اعداد و شمار بھی ہیں جن پر ڈاکٹر مسعود حسین خان نے ہماری زبان میں تبصرہ کیا ہے، اردو
ہندی کا مسئلہ زیادہ تر اتر پردیش اور اس کے بعد بہار میں ہے، ان دونوں صوبوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد اس طرح
گھٹائی گئی ہے کہ بہار میں اس غلط بنیاد پر کہ اردو ہندی ہی کی ایک شکل ہے، اس کو مستقل زبان نہیں مانا گیا ہے، اور اردو
بولنے والوں کے اعداد ہندی میں شامل کر لیے گئے ہیں، حالانکہ بہار کی مقامی بولیوں تک کے اعداد الگ دیے گئے ہیں، اس سے
ایک طرف بہار میں اردو کی مستقل حیثیت ختم ہو گئی، دوسری طرف مقامی بولیوں کے مقابلہ میں ہندی بولنے والوں کی تعداد بڑھ گئی
اتر پردیش میں صرف دو ہی زبانیں ہیں، اردو یا ہندی، اس لیے یہاں اردو کے مقابلہ میں ایک تیسری زبان ہندوستانی کھڑی
کی گئی ہے، اس طرح اردو بولنے والوں کی تعداد ہندوستانی میں تقسیم کر کے گھٹائی گئی ہے، حالانکہ یہ کام اس زحمت کے بغیر
بھی ہو سکتا تھا، جیسا کہ پورے صوبہ میں کیا گیا ہے۔

اردو بولنے والوں کی تعداد کو اس صوبہ میں جس طرح گھٹایا گیا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دہلی اور
مشرقی اضلاع کا ذکر نہیں، سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ، بلند شہر، علی گڈھ، آگرہ، بریلی، بجنور، بدایوں، مراد آباد، شاہجہانپور، فرخ آباد
اٹاوہ، کانپور اور لکھنؤ جیسے اضلاع میں جہاں اردو بولنے والوں کی اکثریت مسلّم مانی جاتی ہے، ہندی بولنے والوں کی تعداد [illegible]
فیصدی بلکہ ۹۰ فیصدی تک دکھائی گئی ہے، حد یہ ہے کہ لکھنؤ کے ضلع کی زبان ۶۲ فی صدی ہندی، ۲۰ فی صدی ہندوستانی
اور کل ۱۵ فی صدی اردو دکھائی گئی ہے، تنہا یہ مثال اس ثبوت کے لیے کافی ہے کہ کس طرح اردو کو ختم کرنے کی
کوشش کی جا رہی ہے، جب ناسخ و آتش، انیس و دبیر، نسیم و چکبست کی سرزمین میں تینوں زبانوں کے بولنے والوں

میں یہ تناسب ہوگا تو دوسرے اضلاع کا کیا ذکر، مگر یہ بھی غنیمت ہے کہ کسی درجہ میں سہی اردو کا وجود تو تسلیم کیا گیا
ورنہ اگر سمپورنانند جی کی طرح اردو کے وجود ہی سے انکار کر دیا جاتا تو کون منوا سکتا تھا، مگر یہ اعداد شمار بھی مطلق انکار
سے کم مضحکہ انگیز نہیں ہیں۔

اردو کے دو بڑے مرکز تھے، دہلی اور لکھنؤ، لکھنؤ کے صوبہ کی سرکاری زبان کئی سال سے ہندی قرار پا چکی ہے، یہاں کے
اسکولوں تک میں اردو کی تعلیم کی گنجائش نہیں، اور حکومت کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ چند سال کے عرصہ میں لکھنؤ کی زبان
۶۲ فیصدی ہندی ہو گئی، اور کل ۱۵ فیصدی اردو رہ گئی، اگر ہندی کی ترقی کی یہی رفتار رہی تو آئندہ مردم شماری میں
اردو کا نام بھی باقی نہ رہ جائے گا، لکھنؤ کا قصہ تو اس طرح ختم ہوا" یادگار بزم غالب ایک دہلی رہ گئی" تھی، اس کی سرکاری
زبان بھی ہندی بنانے کی تجویز ایک مرتبہ پیش ہو چکی ہے، مگر گوپی ناتھ امن کی مخالفت کی وجہ سے مسترد ہو گئی تھی، لیکن
جناب امن کب تک اردو کی جان کو امان دلا سکتے تھے، اب خود دہلی کی سرکار نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس سال سے
ریاست دہلی کی زبان ہندی کر دی جائے گی، اور آئندہ سال سے اس کا سارا کاروبار ہندی میں ہوگا، اور جب ان
دونوں مرکزوں سے اردو ختم ہو جائیگی، تو پھر اس کا ٹھکانا کہاں ہوگا،

ع کر دیا سفاک نے میدان صاف

اتر پردیش کی حکومت کا رویہ ابتک وہی ہے، اس نے دکھلانے کے لیے اردو کو جو حقوق دیے بھی ہیں ان پر عمل نہیں ہو رہا ہے
حافظ ابراہیم صاحب نے بجٹ کی تقریر کے سلسلہ میں اردو کے بارہ میں حکومت کی جو پالیسی ظاہر کی ہے اور جس بنیاد پر کہ "اردو بھی
اتر پردیش میں بولی جاتی ہے" اس غیر سرکاری زبان کو جس قسم کی امداد دینے کا وعدہ کیا ہے، وہ کوئی نیا نہیں ہے، پرائمری اور سکنڈری اسکولوں
میں خاص شرائط کے ساتھ اردو تعلیم کی اجازت اور اس کے انتظام کا وعدہ پہلے سے ہے، اور اس کے بارہ میں حکومت کے احکام بھی
موجود ہیں، سرکاری دفتروں میں بھی اردو میں درخواست دینے کی اجازت ہے جس کا اظہار حافظ ابراہیم صاحب نے اپنی تقریر میں بھی کیا
مگر سوال یہ ہے کہ ان پر عمل کہاں تک ہو رہا ہے، ان شعبوں کے عمال حکومت کے احکام کی تعمیل میں جو رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں ان سے
حافظ صاحب بے خبر نہ ہوں گے، اسلیے انکی تقریر کے بعد بھی اس پر عمل کا سوال باقی رہ جاتا ہے، اگر حقیقۃً حکومت کی پالیسی وہی ہے

جو حافظ صاحب نے ظاہر کی ہے تو اس پر عمل بھی ہونا چاہیے اور جو لوگ اس میں رکاوٹ پیدا کریں ان سے باز پرس ہونی چاہیے، اور اردو کا حق محض تعلیم اور اردو درخواستوں تک محدود نہ ہونا چاہیے، بلکہ اس کو وہ تمام سہولتیں ملنی چاہئیں جو علاقائی زبان کی حیثیت سے اس کا حق ہیں، ورنہ محض زبانی وعدہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں، تاہم ایک ایک ذمہ دار وزیر کی زبان سے اس تصریح کے ساتھ پہلی مرتبہ اعلان کیا گیا ہے، اس لئے حسن ظن یہی رکھنا چاہیے کہ شاید اس پر عمل بھی ہو،

اردو کے بارہ میں حافظ صاحب کی تقریر کے بعض فقرے ایسے عبرت انگیز ہیں کہ بے اختیار اکبر الہ آبادی کا یہ قطعہ یاد آگیا:

انہی کی مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات انکی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات انکی

فقط میرا ہاتھ چل رہا ہے انہی کا مطلب نکل رہا ہے
انہی کا مضمون انہی کا کاغذ قلم انہی کی دوات انکی

مگر وہ بھی مجبور ہیں، حکومت کے نمایندے کی حیثیت سے اس کے سوا وہ اور کیا کہہ سکتے تھے، مگر ہم کو یقین ہے کہ ان فقروں کے بولتے وقت ان کے دل نے ان کی زبان کا ساتھ نہ دیا ہوگا،

اردو علاقائی زبان کا میمورنڈم صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش ہوئے، ایک سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا ہو مگر ابھی تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا معلوم نہیں انتظار کی یہ مدت کبتک بڑھے گی، درحقیقت مرکزی حکومت خود اس بارہ میں کشمکش میں مبتلا ہے، ایک طرف ہندوستان کے دستور میں اردو کو بھی ہندوستان کی چودہ زبانوں میں ایک زبان مانا گیا ہے، پنڈت جواہر لال بھی اس کی حمایت میں ہیں، لیکن اکثریت اس کے مخالفین کی ہے، ایسی حالت میں انکے خلاف فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے، مگر اس انتظار سے تو یہ کہیں بہتر تھا کہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو جاتا، خواہ وہ خلاف ہی کیوں نہ ہوتا، امید و بیم کی یہ کیفیت تو ختم ہوتی، اور اردو کے حامی کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرتے،

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ اردو زبان کے کہن سال مصنف مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی نے ۸۵ سال کی عمر میں انتقال کیا، اردو کے پرانے مصنفین میں اسوقت وہ سب سے زیادہ معمر تھے جبتک انکے قوی کام دیتے رہے لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رہا، مگر ادھر کئی سال سے ضعف پیری کیوجہ سے چھوٹ گیا تھا، وہ معارف کے پرانے مضمون نگار تھے جس موضوع پر لکھتے تھے معلومات کا انبار لگا دیتے تھے، متفرق مضامین کے علاوہ حیات جلیل، تاریخ الہ آباد، صوبہ اودھ اور ان کا مستقبل وغیرہ کئی کتابیں انکی یادگار ہیں، انکی موت سے ایک پرانی علمی یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ مقبول احمد کو آخرت کی مقبولیت سے سرفراز فرمائے،

مقالات

قرآن مجید میں آیت رجم

از جناب مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی

یہ مضمون درحقیقت ایک سوال کا جواب ہے، مگر بحث کی اہمیت کی بنا پر اسکو مقالات میں شائع کرنا مناسب معلوم ہوا،

اسلام نے جرائم کی روک تھام کے لیے جو سخت سزائیں مقرر کی ہیں، ان میں ایک سزا سزائے رجم بھی ہے، یعنی کوئی بالغ شادی شدہ اگر زنا کا ارتکاب کرے، تو اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ شرعی شہادت یا اقرار کے بعد زانی اور زانیہ دونوں کو سنگسار کر دے، اور اس سلسلہ میں ان پر کوئی نرمی روا نہ رکھے۔

جہاں تک سزائے رجم کی فرضیت اور اس کے اسلامی حد (سزا) ہونے کا تعلق ہے، وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ثابت ہے، قرآن مجید میں متعدد ایسی آیتیں ہیں جن میں اجمالاً اور اشارۃً رجم کا ذکر ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار شادی شدہ زانیوں کو رجم کی سزا دی ہے، اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی اپنے اپنے عہد میں اس سزا کو عملاً نافذ کیا ہے، اس لیے اس سزا کی فرضیت میں کسی قسم کے شبہہ اور شک کی گنجائش نہیں ہے، لیکن قرآن میں غیر شادی شدہ بالغ زانیوں کی سزا سو کوڑے کا ذکر جس صراحت و وضاحت کے ساتھ ہے، اس صراحت و وضاحت کے ساتھ سزائے رجم کا ذکر نہیں ہے، اس لیے ابتدا ہی سے بعض شک پسند اور کم علم لوگوں کے دلوں میں اس سزا کے حکم الٰہی

ہونے کے بارے میں شبہات پیدا ہونے لگے تھے، بعد میں جن کی نمایندگی اجتماعی طور پر خوارج اور معتزلہ نے کی، اور اس زمانہ میں ان فرقوں کی نمایندگی نئے "اہل اعتزال" کر رہے ہیں،

حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اس سوال اور اس قسم کے بعض دوسرے سوالات کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں، آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو ایک اہم تقریر فرمائی، اس تقریر میں سب سے پہلے جس بات کا ذکر کیا وہ یہ تھی کہ

"لوگو! تم میں کچھ لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ قرآن میں رجم کا حکم موجود نہیں ہے، بلکہ اس میں محض جَلْد (کوڑے کی سزا) کا ذکر ہے، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے، بلاشبہہ رجم کا حکم قرآن میں موجود ہے، اور وہ بھی دوسرے فرائض کی طرح ایک فریضہ ہے جسے خدا نے نازل فرمایا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کی سزا دی ہے، اور ان کے بعد ہم نے بھی اس پر عمل کیا ہے۔"

بخاری، مسلم اور ترمذی وغیرہ میں اس تقریر کے الفاظ بس اسی قدر ہیں، مگر حدیث کی بعض دوسری کتابوں میں حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ سزائے رجم کے سلسلہ میں ایک آیت الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھما البتة نازل ہوئی تھی، مگر بعد میں اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی، اور اس کا حکم باقی رکھا گیا، یعنی حضرت عمرؓ نے اپنی تقریر میں رجم کے جس حکم کے قرآن میں موجود ہونے کا ذکر کیا ہے اس سے ان کی مراد یہی منسوخ التلاوۃ آیت ہے،

یہ روایت جس کو متعدد محدثین اور مفسرین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، ممکن ہے سلسلۂ سند کے اعتبار سے اس کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف صحیح ہو، مگر عاجز نے اس بارے میں جو طالب علمانہ تحقیق کی ہے، اس کے لحاظ سے نہ تو اس ٹکڑے کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف صحیح ثابت ہوتی ہے اور نہ اس کا منسوخ یا غیر منسوخ کلام الٰہی ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے، مگر محدثین و مفسرین کی ایک بڑی تعداد اس ٹکڑے کو منسوخ تسلیم کرتی ہے، اس لیے ہم اس کے قرآن کا جزو ہونے یا نہ ہونے پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیں گے، تاکہ اہل علم کے سامنے

یہ مسئلہ پوری وضاحت کے ساتھ آجائے، اور ان کو میری رائے سے اتفاق یا اختلاف کرنے میں آسانی ہو،

زنا، محرکات زنا اور سزائے زنا کے تدریجی احکام

مذکورۂ بالا ٹکڑے پر کلام کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زنا اور اس کی سزا کے سلسلہ میں جو تدریجی احکام نازل ہوئے ہیں، ان پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے، تاکہ اصل مسئلہ کے سمجھنے میں سہولت ہو،

مکی دورِ نبوت میں سورہ اسرا کے نزول سے پہلے اس کے بارے میں صراحۃً کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، مگر مجملاً و اشارۃً ہمیشہ ان تمام کاموں سے روکا گیا، جو محرکات زنا ہو سکتے تھے، چنانچہ سورہ نحل میں جہاں بہت سے اوامر و نواہی کا ذکر ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (نحل-۱۳) — خدا بیحیائی، برائی اور ظلم سے روکتا ہے،

اس کے بعد سورہ انعام میں ذرا اور وضاحت کے ساتھ یہ حکم دیا گیا:-

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (انعام، رکوع ۱۹) — فواحش اور بیحیائی کے جتنے طریقے ہیں، خواہ وہ پوشیدہ ہوں یا ظاہر ان کے قریب نہ جاؤ۔

ان آیتوں میں فحشا، فواحش اور منکر کی کوئی تشریح نہیں کی گئی تھی، مگر لفظ کی عمومیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین و تفسیر سے مسلمانوں نے زنا کی حرمت کو سمجھ لیا تھا، اور اس کے محرکات تک سے بچنے لگے تھے، مکہ میں وہ اس حیثیت میں نہیں تھے کہ اس حکم کو قانوناً پورے معاشرہ پر نافذ کر سکتے، مگر دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں جب بھی اس کا موقع آجاتا تھا، حتی المقدور فواحش اور ان کے محرکات سے لوگوں کو باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے، اور اس میں مسلمانوں ہی کی تخصیص نہیں تھی، بلکہ وہ عام اہل عرب اور کفار قریش سے بھی تعرض کرتے تھے،

اہل مکہ کا دستور تھا کہ وہ کعبہ کا طواف برہنہ ہو کر کرتے تھے، چونکہ یہ کھلی ہوئی بیحیائی اور محرک ہوس روش تھی، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے اس پر ناپسندیدگی ظاہر کی، جس کے جواب میں انھوں نے

کہا کہ یہ تو حکم الٰہی ہے اور باپ دادا کے زمانہ سے ہوتا آیا ہے۔ اس سوال وجواب کو قرآن نے نقل کیا ہے،

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ

(اعراف، رکوع ۴)

جب وہ کوئی فحش کام کرتے ہیں (اور ان کو ٹوکا جاتا ہے) تو کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا ایسا ہی کرتے آئے ہیں، اور حکم الٰہی بھی یہی ہے، کہدیجیے کہ اللہ تعالیٰ بیحیائی وفحاشی کا حکم نہیں دیتا، بغیر کسی دلیل کے خدا پر بہتان باندھتے ہو،

سورہ اعراف کے نزول تک قرآن میں اسی عمومی انداز سے زنا اور اس کے محرکات کی برائی کی گئی، صراحۃً زنا کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا، ہجرت سے چند ماہ پیشتر سورہ اسرا کا نزول ہوا، تو اس میں جہاں اور بہت سے تمدنی ومعاشرتی احکام نازل ہوئے، زنا کے بارے میں بھی واضح طور پر یہ حکم دیا گیا کہ

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا (رکوع ۴)

زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، یہ نہایت ہی بیحیائی کا کام اور بری راہ ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں امام احمد بن حنبلؒ نے عہد نبوی کا یہ واقعہ نقل کیا ہے، کہ "ایک نوجوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہم کو زنا کی اجازت دیدیجئے، صحابہ نے اس گستاخی پر اسکو ڈانٹنا چاہا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو روکا اور نوجوان کو اپنے پاس بلا کر نہایت نرمی سے فرمایا کہ کیا تم یہ حرکت اپنی ماں، بہن، خالہ اور بیٹی کے ساتھ کرنا پسند کروگے" بولا نہیں یا رسول اللہ میں کیسے پسند کرسکتا ہوں، آپ نے فرمایا، پھر اسی طرح دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ یہ حرکت پسند نہیں کرتے، پھر آپ نے اس کے لیے دعا فرمائی، اس کے بعد اس کا حال یہ ہو گیا کہ وہ عورتوں کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا"

ہجرت سے چند ماہ پہلے جب انصار کا دوسرا قافلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا

تو آپ نے ان سے جن باتوں پر بیعت لی تھی، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ "زنا کے قریب نہ جانا"

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ ہجرت سے پہلے زنا سے اجتناب کا صریح حکم آچکا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مطابق مسلمانوں اور عام اہل مکہ کو اس سے باز رکھنے کی کوشش اور اس کے ارتکاب پر روک ٹوک بھی کرتے تھے، مگر ابتک یہ فعل فوجداری کا جرم نہیں قرار پایا تھا، اور نہ اس کی سزا مقرر ہوئی تھی، اور اس وقت مسلمان جن حالات میں تھے، ان میں یہ ممکن بھی نہیں تھا ہجرت کے بعد گو مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوگیا تھا، اور انھوں نے اسلامی حکومت کی داغ بیل بھی ڈال دی تھی، پھر بھی دو تین سال تک وہ فوجداری قوانین کے نفاذ پر قادر نہیں ہوسکے تھے، مگر جب ذرا اسلامی حکومت کو استحکام نصیب ہوا اور فوجداری سزاؤں کے نفاذ پر مسلمانوں کو قدرت حاصل ہوئی، تو فوراً یہ فعل فوجداری جرم قرار پایا اور اس کی سزا مقرر ہوئی، اس سلسلہ میں سب سے پہلا حکم سورہ نسا[1] میں یہ نازل ہوا،

وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا وَاللَّذَانِ يَأْتِيَانِهَا مِنكُمْ فَآذُوهُمَا

(رکوع ۲)

تمھاری عورتوں میں سے جو بھی بیحیائی (زنا) کا کام کریں ان کے اس فعل پر تم اپنوں میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو، اگر وہ گواہی دیدیں تو ان کو اپنے گھروں میں اس وقت تک مقید رکھو یا تو موت ان کا خاتمہ کردے یا پھر خدا ان کے لیے کوئی نئی راہ نکالے یعنی کوئی نیا حکم دے، اور جو دو شخص بھی اس فعل کا ارتکاب کریں انکو تکلیف

پہلی آیت میں مخصوص طور سے شادی شدہ زانیہ عورتوں کی سزا "حبس دوام" مقرر ہوئی اور دوسری آیت میں عام زانیوں کے لیے ایذارسانی کی سزا تجویز کی گئی، مگر اس ایذارسانی (فاذوھما) کی تعیین وتشریح

[1] اس سورہ کا زمانۂ نزول سورۂ احزاب کے بعد ہے، اسی اعتبار سے ۵ھ یا اس کے بعد کا زمانہ اس کا زمانۂ نزول قرار دیا گیا ہے۔

نہیں کی گئی، اس لیے ابتدا میں اس جرم کے عام مرتکبین کو لعنت ملامت اور زد و کوب کرکے چھوڑ دیا جاتا تھا (ابن کثیر)

جس طرح یہ ٹکڑا غیر مبین تھا، اسی طرح پہلی آیت کا آخری جملہ "اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا" خدا اس کے لیے کوئی نیا راستہ پیدا کرے گا، مجمل اور غیر مبین تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی نیا حکم دیا جانے والا ہے، چنانچہ مسلم اور دوسری کتب حدیث میں تھوڑے سے اختلاف الفاظ کے ساتھ اس اجمال کی تفسیر میں یہ روایت منقول ہے:

عن عبادۃ بن صامت قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خذوا عنی خذوا عنی قد جعل اللّٰہ لھن سبیلا البکر بالبکر جلد مائۃ ونفی سنۃ والثیب بالثیب جلد مائۃ والرجم
(مسلم باب حد الزنا)

عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نے جو نیا حکم زانی عورتوں کی سزا کے بارے میں دیا ہے اسے مجھ سے سن لو، یاد کرلو اور دوسروں تک پہنچا دو۔ وہ یہ ہے کہ اگر زانی خواہ مرد ہو یا عورت اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو اس کی سزا سو کوڑے اور ایک سال جلاوطنی ہے اور اگر وہ شادی شدہ ہو تو سو کوڑے اور

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں جو بات مجمل اور غیر مبین تھی، اس کو آپ نے منشائے الٰہی کے مطابق واضح فرما دیا، اور اس طرح خدا نے جو راستہ نکالنے کا وعدہ فرمایا تھا، وہ بھی آپ کی زبان سے پورا ہوگیا، اس ارشاد نبوی سے حسب ذیل احکام نکلتے ہیں،

۱۔ زانی عورتوں کی سزا "حبس دوام" اور عام زانیوں کی سزا "ایذا رسانی" کی تفریق باقی نہیں رہی، اب یہ تفریق شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے اعتبار سے ہوگی۔

۲۔ اگر زانی بالغ کنوارے ہیں تو خواہ مرد ہوں یا عورت جوان ہوں یا بوڑھے، ان کو سو کوڑے

مارے جائیں گے اور ایک سال کے لیے جلاوطن کردیا جائے گا،

۳۔ اگر وہ بالغ شادی شدہ ہیں تو ان کو سو کوڑے مار کر رجم کردیا جائے گا،

ایک مدت تک ان سزاؤں پر عمل درآمد ہوتا رہا، اس کے بعد سنہ ۵ھ یا اس کے لگ بھگ جب سورہ نور کا نزول ہوا تو ان سزاؤں میں اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی اصلاح کردی،

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ (رکوع ۱)

زانی اور زانیہ میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو،

اس حکم میں سو کوڑے کی سزا تو علیٰ حالہ باقی رہی، مگر اس کے ساتھ جلاوطنی کی سزا کو نہ تو ضروری قرار دیا اور نہ اس سے منع ہی کیا گیا، گویا قرآن نے یہ بات اسلامی حکومت کے اختیار پر چھوڑ دی کہ اگر وہ چاہے تو یہ سزا بھی دے سکتی ہے اور نہ چاہے تو اس کا بھی اس کو اختیار ہے، اسی بنا پر اس سزا کے بارے میں صحابہ اور ائمہ کے درمیان اختلاف ہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دونوں سزائیں ساتھ دی ہیں،[1] حضرت عمرؓ نے بھی کبھی دونوں سزائیں دیں اور کبھی ایک پر اکتفا کیا،[2]

ائمہ میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے کہ عام حالت میں تو جلد (کوڑے کی سزا) اور تغریب (جلاوطنی) ایک ساتھ نہ دینا چاہیے، البتہ امام وقت اگر کسی وقت جلاوطنی کی ضرورت محسوس کرے تو اس کو اس کا اختیار ہے، مگر اس کے لیے ایک سال کی قید کی ضرورت نہیں ہے، اس میں کمی بیشی ہوسکتی ہے،

امام مالک فرماتے ہیں کہ مرد کو تو جلاوطن کیا جاسکتا ہے، مگر عورت کو یہ سزا نہیں دی جاسکتی، اس لیے کہ اس میں بہت سی اخلاقی خرابیوں کا اندیشہ ہے، امام شافعی اور امام احمد کی رائے ہے کہ دونوں سزائیں ساتھ ساتھ دینی چاہئیں،

دوسری سزا کے بارے میں قرآن نے تو کوئی صریح حکم نہیں دیا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] زرقانی شرح موطا کتاب الحدود [2] کنز العمال

نے یہ اصلاح فرمائی کہ سزائے رجم کو تو جوں کا توں باقی رکھا، مگر اس کے ساتھ جَلْدْ کو ضروری قرار نہیں دیا اور اس جرم میں خود آپؐ نے جو سزائیں دیں، ان میں بھی دونوں سزاؤں کو ایک ساتھ جمع نہیں کیا، مگر چونکہ آپؐ نے صراحۃً اس کی ممانعت نہیں فرمائی تھی، اس لیے اس بارے میں بھی حضرات صحابہؓ اور ائمہ میں اختلاف ہوا،

حضرت علیؓ، عمرو بن عاصؓ، حسن بصریؒ، اسحاق بن راہویہ اور امام احمد بن حنبل کی رائے ہے کہ دونوں سزاؤں کو ایک ساتھ دیا جا سکتا ہے، ان کے علاوہ عام صحابہ اور ائمہ رجم کے ساتھ جلد ضروری نہیں سمجھتے، لیکن اگر امام وقت دونوں سزاؤں کو ایک ساتھ دے تو اس پر کوئی نکیر نہیں کی جا سکتی،

اوپر کتاب و سنت کی روشنی میں زنا اور اس کی سزا کے احکام کی جو تدریجی ترتیب دکھائی گئی ہے، اس سے ایک عام اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ سزائے رجم کے سلسلہ میں یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ قرآن میں آیت رجم کا نزول ہوا تھا، جو بعد میں منسوخ التلاوت قرار دی گئی، بلکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سورۂ نساء کی جس آیت کی روشنی میں مرضیِ خداوندی کے مطابق آپؐ نے رجم کی سزا تجویز فرمائی تھی، وہ اب بھی قرآن کا جزء ہے،

ممکن ہے کہ بعض اہل علم کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ تو حدیث نبوی سے آیت کا نسخ ہوا تو اس شبہ کے ازالہ کے لیے عرض ہے کہ اگر فقہی و قیاسی بحثوں سے علیحدہ ہو کر اس پر غور کیا جائے تو اس موقع پر حدیث نبوی سے قرآن کے نسخ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لیے کہ سورۂ نساء کے نزول کے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ سزائے زنا کے سلسلہ میں جلد ہی کوئی نیا حکم دیا جانے والا ہے، چنانچہ یہی وعدۂ الٰہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پورا ہوا، اصطلاحی زبان میں اس کو اس طرح

لہ مستدرک حاکم ج ۴ ص ۳۷۰،

کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے ایک محکم حکم کو مفسر یا غیر مبیّن و مجمل حکم کو مبیّن و مفصل فرما دیا، اس سلسلہ میں ہم چند محدثین کی رائیں نقل کرتے ہیں،

چوتھی صدی کے مشہور محدث ابو سلیمان خطابی مذکورہ آیت و حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

بل هو مبين للحكم الموعود بيانه في الآية فكانه قال عقوبتهن الحبس الى ان يجعل الله لهن سبيلا فوقع الامر بحبسهن الى غاية فلما انتهت مدة الحبس وحان وقت مجى السبيل قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خذوا عنى تفسير السبيل وبيانه ولم يكن ذلك ابتداء حكم منه وانما هو بيان امر كان ذكر السبيل منطويا عليه فابان المبهم منه وفصل المجمل من لفظه ..... وهذا اصوب القولين [1]

آپ نے اس حکم موعود کی تشریح کی ہے جس کا ذکر سورۂ نساء کی آیت میں ہوا ہے، تو گویا خدا نے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ عورتوں کو حبس دوام کی سزا اس وقت تک دی جائے جب تک خدا ان کے لیے دوسری راہ نہ نکال دے، چنانچہ جب وہ مدت پوری ہو گئی اور نئے حکم کا موقع آ گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منشائے الٰہی کے مطابق اس نئے راستہ یا اس حکم موعود کی تفسیر و تعیین فرما دی، تو خلاصہ یہ کہ آپ کا یہ ارشاد اس سلسلہ کا ابتدائی یا کوئی نیا حکم نہیں تھا، بلکہ جو امر ارشاد خداوندی میں پوشیدہ تھا اسے آپ نے ظاہر فرما دیا، تو یہ سمجھو کہ آپ نے ایک مبہم حکم کو مبیّن اور مجمل کو مفصل کر دیا ...... اس سلسلہ میں سب سے

یہ زیادہ صحیح قول ہے

امام نوویؒ مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں

اما قوله عليه السلام قد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ اللہ تعالیٰ نے

لہ معالم السنن

جعل الله لهن سبيلا فاشار الى قوله تعالى فامسكوهن في البيوت حتى يتوفاهن الموت او يجعل الله لهن سبيلا بين النبي صلى الله عليه وسلم ان هذا هو السبيل

نے ان کے لیے یہ راہ نکالی ہے" یہ اشارہ ہے خداتعالیٰ کے اس فرمان کی طرف فامسکوھن فی البیوت حتی یتوفاھن الموت او یجعل اللہ لھن سبیلا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واضح فرمادیا کہ وہ راستہ یہ ہے جو میں بتا رہا ہوں،

اس تشریح کے بعد اس حدیث و آیت کے ربط و تعلق کے بارے میں جو رائیں دی گئی ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فقيل هي محكمة وهذا الحديث مفسر لها وقيل منسوخة بالآية التي في اول سورة النور وقيل ان آية النور في البكرين وهذه الآية في الثيبين .... (شرح نووی باب حد الزنا)

کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ سورہ نساء کی آیت محکم ہے اور یہ ارشاد نبوی اس کی تفسیر ہے بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ آیت سورہ نور کی ابتدائی آیت سے منسوخ ہو گئی اور بعض اہل علم یہ کہتے ہیں کہ سورہ نور کی آیت بکر (کنواروں) سے متعلق ہے اور سورۂ نساء کی آیت ثیبین (شادی شدہ) مرتکبین زنا سے متعلق ہے۔

امام نووی نے اس بارے میں اہل علم کی جو تین رائیں نقل کی ہیں، ان میں سے پہلی رائے سے پتہ چلتا ہے کہ سورہ نساء کی آیت اور مذکورہ ارشاد نبوی کا تعلق ناسخ و منسوخ کا نہیں بلکہ محکم و مفسر یا مجمل و مفصل کا ہے، دوسری رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نساء کی آیت سورہ نور کی ابتدائی آیت سے منسوخ ہے اور تیسری رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں آیتوں میں نہ کوئی ناسخ ہے اور نہ منسوخ، بلکہ دونوں کا منشائے نزول اور حکم جدا جدا ہے، سورۂ نساء کی آیت میں رجم کا حکم ہے اور سورہ نور کی آیت میں جلد کا

امام نووی اور امام خطابی دونوں کی رایوں کو اگر سامنے رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے ان آیات و احادیث کے بارے میں ناسخ و منسوخ کی بحث کو چھیڑا ہے ان کی رایوں کو ان دونوں اماموں نے مرجح قرار نہیں دیا ہے،

پھر ان آیات اور احادیث کے بارے میں ناسخ و منسوخ کی بحث اس لیے بھی صحیح نہیں ہے کہ اگر سورہ نساء کی آیت کو سورہ نور سے منسوخ قرار دیا جائے تو اس آیت کے ایک ٹکڑے کو جس میں "حبس" کا تذکرہ ہے منسوخ قرار دیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اب یہ حکم باقی نہیں رہا، مگر پوری آیت کو جس میں رجم کا مجمل حکم اور زنا کی چار شہادتوں کا ذکر ہے، منسوخ نہیں قرار دیا جا سکتا، اسلیے اس سلسلہ میں نسخ کی بحث نہ تو صحیح ہے اور نہ مفید،

اوپر کی تفصیلات سے حسب ذیل باتیں مستنبط ہوتی ہیں:

۱- زنا اور اس کے محرکات سے اجتناب کا حکم ہجرت سے پہلے آچکا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں اور عام اہل مکہ کو اس سے باز رکھنے کی کوشش فرماتے تھے،

۲- زنا کی فوجداری سزا ہجرت کے کئی سال بعد مقرر ہوئی،

۳- ابتدا میں زانی عورتوں اور عام زانیوں کی سزائیں مختلف تھیں، اور ایک مدت تک اسی پر عمل رہا، پھر یہ تقسیم ختم کر دی گئی اور اس کے بجائے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی حیثیت سے سزا مقرر ہوئی،

۴- شادی شدہ کی سزا رجم اور جلد مقرر ہوئی، اور غیر شادی شدہ کی جلد اور تغریب،

۵- پھر پہلی سزا میں یہ اصلاح ہوئی کہ رجم کے ساتھ جلد ضروری نہیں رہا، اور دوسری سزا میں محض جلد ضروری قرار دیا گیا اور تغریب کو اسلامی حکومت کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا گیا،

۶- غیر شادی شدہ یعنی کنوارے زانیوں کی سزا جلد قرآن میں صراحۃً مذکور ہے اور بالغ شادی شدہ زانیوں کی سزا رجم کا حکم قرآن میں صراحۃً نہیں بلکہ اجمالاً اور اشارۃً ہے جس کی توضیح اور تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منشائے الٰہی کے مطابق فرمائی ہے،

اس تمہید کے بعد اب ہم اس "ٹکڑے" پر بحث کرتے ہیں جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن کی ایک آیت تھی جو بعد میں منسوخ ہو گئی، اس "ٹکڑے" کے کلام الٰہی نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہو کہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ قرآن میں آیت رجم نازل ہوئی تھی، مگر اس کی "تلاوت منسوخ ہو گئی اور اس کا حکم باقی ہے" حالانکہ جب بھی قرآن کا کوئی "ٹکڑا" نازل ہوتا تھا اُسکا علم ہر خاص و عام کو ہو جاتا تھا، اور رجم کے سلسلہ میں کسی صریح آیت کے نزول کا علم تو اور زیادہ زبان زد خاص ہونا چاہیے تھا، اس لیے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے عام مجمع میں متعدد بار رجم کی سزا دی ہے، اور ان سزا پانے والوں میں مسلمان ہی نہیں بلکہ یہودی بھی تھے، اس لیے اس کا چرچا تو گھر گھر ہوا ہو گا، ایسی صورت میں اگر رجم کے بارے میں کوئی صریح آیت نازل ہوتی تو بہتوں کو اس کا علم ہوتا اور وہ آیت بہت سے لوگوں کے سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہو جاتی، اور جب وہ منسوخ قرار دیجاتی تو اس کا علم بھی اسی اعتبار سے بہت سے افراد کو ہونا چاہیے تھا، مگر اس سلسلہ میں محض چار صحابہ کے بارے میں یہ ذکر ملتا ہے کہ انھوں نے مذکورہ "ٹکڑے" کو آیت رجم بتایا ہے، ان میں سے ہر ایک کا بیان دوسرے سے مختلف اور بعض حیثیتوں سے مضطرب اور متضاد ہے، حالانکہ کسی کلام کو کلام الٰہی کہنے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی روایت متواتر ہو، اور یہ "ٹکڑا" متواتر کیا مشہور بھی نہیں ہے، ہم ان چاروں روایتوں کو نقل کر کے ہر ایک پر الگ الگ بحث کریں گے،

پہلی روایت

عن زر بن جبیش قال قال لی	زر بن جبیش سے مروی ہے کہ مجھ سے حضرت
ابی بن کعب وکان یقرأ سورة الاحزاب	ابی بن کعب نے پوچھا کہ سورہ احزاب میں کتنی
قال قلت ثلاثا وثلثین اٰیة قال	آیتیں ہیں، میں نے کہا کہ ۷۳ آیتیں ہیں، پوچھا
قط؟ قلت قط؟ قال لقد	کہ بس اسی قدر آیتیں ہیں، میں نے کہا ہاں محض
رأیتها انها لتعدل البقرة	۷۳ آیتیں ہیں، انھوں نے کہا میں نے پوری

ولقد قرأنا فیما قرأنا فیها الشیخ	سورہ دیکھی تھی، وہ قریب قریب سورہ بقرہ
والشیخة اذا زنیا فارجموهما	کے برابر تھی، اس میں جو آیتیں ہم نے پڑھی
البتة نکالا من الله والله	تھیں ان ہی میں ایک آیت الشیخ والشیخة
عزیز حکیم[1]	اذا زنیا فارجموهما البتة نکالا من
....	الله والله عزیز حکیم بھی تھی،

دوسری روایت ابو امامہ بن سہل اپنی خالہ یا پھوپھی سے روایت کرتے ہیں،

قالت لقد قرأنا رسول الله صلی الله	انھوں نے کہا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
علیه وسلم اٰیة الرجم الشیخ	نے آیت رجم پڑھائی تھی، اور وہ یہ ہے
والشیخة اذا زنیا فارجموهما	الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما
البتة بما قضینا من اللذة[2]	البتة بما قضینا من اللذة

تیسری روایت کثیر بن الصلت کا بیان ہے کہ حضرت عمرو بن عاص اور حضرت زید بن ثابت مصحف کی کتابت کر رہے تھے کہ آیت مذکور سامنے آئی، زید بن ثابت نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

یقول الشیخ والشیخة اذا زنیا	الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما
فارجموهما البتة فقال عمرو لما	البتة کہتے ہوئے سنا ہے، حضرت عمرو بن عاص نے
نزلت اتیت النبی صلی الله علیه وسلم	کہا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
فقلت اکتبها فکانه کره ذلک	کے پاس حاضر ہو کر عرض کی، یا رسول اللہ!
فقال عمرو الا تری ان الشیخ	آپ اسے لکھوا دیجئے، تو آپ نے اس پر ناگواری

[1] یہ روایت مستدرک حاکم اور سنن بیہقی دونوں میں مندرج ہے، روایت کے الفاظ ہم نے مستدرک سے نقل کیے ہیں مگر اس کے ابتدائی حصہ کا مفہوم زیادہ واضح نہیں تھا، اسلیے ترجمہ دونوں روایتوں کو سامنے رکھکر کیا گیا ہے۔ [2] مستدرک ج ۴ ص ۳۵۹

اذا زنی وقد احصن جلد ورجم
واذا لم یحصن جلد وان الثیب
اذا زنی وقد احصن رجم[1]
....

انکار فرمایا، پھر ابن عاصؓ نے حضرت زیدؓ سے کہا کہ (اس ناگواری کی وجہ اس آیت کی لفظی و معنوی خامی ہے) آپ اس پر غور کیجئے، اس میں مطلقاً بوڑھے زانیوں کو رجم کی سزا تجویز کی گئی ہے،

چوتھی روایت | اس سلسلہ کی سب سے اہم روایت حضرت عمرؓ کی ہے، جس کو امام مالک نے موطا میں نقل کیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

ایاکم ان تھلکوا عن آیۃ الرجم
.......والذی نفسی بیدہ
لولا ان یقول الناس زاد عمر
فی کتاب اللہ لکتبتھا بیدی الشیخ
والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ

میں تم کو آگاہ کرتا ہوں کہ آیت رجم کے بارے میں شک کرکے ہلاکت میں نہ پڑو، خدا کی قسم اگر لوگ یہ نہ کہتے کہ عمر نے قرآن میں زیادتی کر دی تو میں اپنے ہاتھ سے اس آیت کو قرآن میں لکھ دیتا،

حضرت عمرؓ کی یہی روایت اب بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد وغیرہ میں ملاحظہ کیجئے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پورے زمانۂ خلافت میں یہ معمول تھا کہ حج کے موقع پر آپ اسلامی مملکت کے تمام صوبوں کے امرا کو مکہ مکرمہ طلب کرتے تھے، اور ان سے ہر ہر صوبہ کے دینی، اخلاقی اور سیاسی حالات دریافت کرتے تھے، جب آپ آخری بار حج کو تشریف لے گئے، تو حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کے ذریعہ ان کو یہ علم ہوا کہ یہاں بعض اسلامی مسائل[2] کے بارے میں کچھ لوگوں کے دلوں میں شبہات

---

[1] یہ روایت بعض دوسرے طریقوں سے بھی مروی ہے، بیہقی اور بعض دوسری حدیث کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت زیدؓ سے یہ گفتگو حضرت عمرو بن عاصؓ سے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ سے ہوئی تھی، اور انہی نے اسکی خامی کی طرف توجہ دلائی تھی [2] ان اسلامی مسائل میں سب سے اہم مسئلے دو تھے، ایک حضرت صدیقؓ کی خلافت، دوسرے سزائے رجم کی فرضیت،

پیدا ہو گئے ہیں، تو انھوں نے فرمایا کہ میں ان مسائل کے بارے میں مجمع عام میں ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں مگر حضرت ابن عوفؓ نے حضرت فاروقؓ سے عرض کیا کہ امیر المومنین یہ عام مجمع ہے، اس میں ہر طرح کے لوگ ہیں، بہت سے لوگ آپ کی تقریر کے مدعا کو سمجھ نہ سکیں گے، اور واپس جا کر نہ جانے اس کے کیا کیا معانی پیدا کریں اور فتنہ اٹھائیں، اس لیے میری رائے ہے کہ آپ یہ تقریر مدینہ منورہ میں کریں، جہاں خواص اہل علم کا مجمع ہوگا، وہ مغز سخن تک پہنچیں گے اور اس کے موقع و محل کو سمجھیں گے، چنانچہ حضرت عمرؓ اس ارادہ سے باز رہے، اور جب مدینہ منورہ واپس ہوئے تو پہلے ہی جمعہ میں ان مسائل پر تقریر فرمائی،

جس کے چند جملے بروایت بخاری یہ ہیں:

امابعد فانی قائل لکم مقالۃ
قد قدرلی ان اقولھا لا ادری
لعلھا بین یدی اجلی فمن عقلھا
ووعاھا فلیحدث بھا حیث
انتھت بہ راحلتہ ومن خشی
ان لا یعقلھا فلا احل لاحد
ان یکذب علی
....
....

میں ایک ایسی تقریر کروں گا جس کا ذکر کرنا میرے لئے انتہائی ضروری ہے، اس لیے کہ میں نہیں جانتا کہ موت ابھی آ جائے، تو جن لوگوں کے اندر اس تقریر کے سمجھنے اور اس کے ذہن نشین کر لینے کی صلاحیت ہو وہ اس کو جہاں تک پہنچا سکیں پہنچا دیں، مگر جن لوگوں کو یہ اندیشہ ہو کہ مغز سخن تک ان کی رسائی نہ ہو سکے گی تو میں ایسے کسی شخص کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میرے اوپر [illegible]

اس تمہید اور تنبیہ کے بعد آپ نے فرمایا کہ

ان اللہ بعث محمداً صلی اللہ علیہ وسلم
بالحق وانزل الکتاب فکان مما

بلا شبہہ خدا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی ہے

انزل الله آية الرجم فقرأناها وعقلناها ووعيناها، رجم رسول الله صلى الله عليه وسلم ورجمنا بعده فاخشى ان طال بالناس زمان ان يقول قائل والله ما نجد آية الرجم في كتاب الله فيضلوا بترك فريضة انزلها الله والرجم في كتاب الله حق على من زنى اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البينة او كان الحبل او الاعتراف[1]

. . . .
. . . .
. . . .
. . . .

خدا نے جو کلام آپ پر نازل فرمایا ہے اس میں آیت رجم بھی ہے، ہم نے اس آیت کو پڑھا سمجھا اور اس کو محفوظ رکھا (اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس رجم کی سزا دی اور آپ کے بعد ہم نے اس پر عمل کیا، میں ڈرتا ہوں کہ ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد کہنے والے یہ کہنے لگیں کہ ہم تو کتاب اللہ میں آیت رجم (صراحۃً) نہیں پاتے، پس اس شبہ میں وہ ایک فریضۂ خداوندی کو ترک کرکے گمراہ ہو جائیں، حالانکہ سزائے رجم کا حکم کتاب اللہ میں (اشارۃً) موجود ہے، یہ سزا ان لوگوں کے لیے ہے جو شادی شدہ ہوں، خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، مگر یہ سزا اس وقت نافذ ہوگی جب اس کا شرعی ثبوت مل جائے یا زانیہ حاملہ ہو جائے یا مجرم خود اعتراف کرلے،

پہلی تینوں روایتوں میں اور حضرت عمرؓ کی جو روایت امام مالک نے نقل کی ہے، اس میں الشیخ والشیخۃ والے ٹکڑے کا ذکر ہے، مگر حضرت عمرؓ کی یہی روایت بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ نے بھی نقل کی ہے، مگر ان میں سے کسی نے اس ٹکڑے کا ذکر نہیں کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان محدثین

[1] بخاری کتاب المحاربین ج ۲ ص ۱۰۰۵

کے نزدیک حضرت عمرؓ کی طرف اس بات کی نسبت صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے اس ٹکڑے کو کلام الٰہی کہا ہو یا صراحۃً یہ فرمایا ہو کہ کتاب اللہ میں رجم کا ثبوت اسی منسوخ التلاوۃ آیت سے ثابت ہے، پھر اس میں اس بات کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ جب اس کا حکم باقی ہے تو اس کی تلاوت کیوں منسوخ قرار دی گئی، اب ان روایتوں پر الگ الگ غور کیجئے،

پہلی روایت کے الفاظ پر غور کیجئے، اس میں ذکر ہے کہ یہ ٹکڑا سورہ احزاب کا جزو تھا، اور سورۂ احزاب میں اس وقت محض ۷۳ آیتیں ہیں، مگر اس کی ضخامت سورہ بقرہ کے برابر تھی، روایت میں صراحۃً یہ ذکر تو نہیں ہے کہ یہ حصہ منسوخ ہو گیا مگر بظاہر اس کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے، اگرچہ اس کا یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ یہ حصہ غائب ہو گیا ہو،

اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ سورہ احزاب کا جو حصہ منسوخ یا غائب ہو گیا ہے، وہ قرآن میں موجودہ حصہ سے کئی گنا زیادہ تھا، اس لیے کہ سورہ احزاب میں کل ۷۳ آیتیں ہیں اور سورہ بقرہ میں ۲۸۶ آیتیں، یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تائید نہ تو کسی حدیث نبویؐ سے ہوتی ہے اور نہ کسی دوسرے صحابی کی روایت سے، ممکن ہے کہ سلسلۂ سند کے اعتبار سے یہ روایت صحیح ہو، اس لیے کہ اس کے سند پر کوئی جرح و تنقید نظر سے نہیں گذری، مگر بہر نوع اصول درایت کے اعتبار سے کسی طرح اس روایت کو صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا، قرآن واضح طور پر اپنے محفوظ اور مکمل ہونے کا اعلان کرتا ہے، اور اس سے اس کا غیر محفوظ ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس لیے ایک روایت کی بنا پر قرآن مجید کو کیسے ناقص قرار دیا جا سکتا ہے،

حضرت ابی بن کعبؓ جن سے یہ روایت منقول ہے، ان کے نیچے کے راوی زر بن حبیش ہیں، ان کے بارے میں محدثین نے لکھا ہے کہ وہ علوی تھے، ممکن ہے کہ ان کی علویت سے فائدہ اٹھا کر کسی شیعی راوی نے ان کی طرف یہ روایت منسوب کر دی ہو، اور چونکہ حضرت ابی بن کعبؓ کے معروف شاگرد تھے

اس لیے روایت کی نسبت ان کی طرف کردی گئی ہو، یہ قیاس اس لیے بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بارے میں بعض شیعوں کا جو تصور ہے، اس میں اور اس روایت میں ہم آہنگی ہے، واللہ اعلم

پھر حضرت ابی بن کعب کی اس روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ رجم کو قرآنی حکم اسی منسوخ التلاوۃ آیت کی وجہ سے تسلیم کرتے تھے، مگر کنز العمال کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو سنت نبوی سمجھتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں تو صحیح نہیں ہوسکتیں، اس لیے لامحالہ ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی پڑے گی، میرے خیال میں دوسری بات اس لیے زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس رائے میں ان کے ساتھ بعض دوسرے جلیل القدر صحابہ بھی شریک ہیں، مگر دوسری میں یہ تنہا ہیں۔

دوسری روایت ابو امامہ یا ابو اسامہ[1] نے اپنی صحابیہ خالہ یا پھوپھی سے کی ہے، رجال اور طبقات کی کتابوں میں نہ تو ابو امامہ بن سہیل کے حالات ملتے ہیں اور نہ ان کی پھوپھی اور خالہ کا ذکر ملتا ہے کہ ان کے نام و نسب اور روایت حدیث میں ان کے مرتبہ کا اندازہ کیا جاسکے، اس لیے اصول درایت سے قطع نظر یہ "جہالت رواۃ" اس روایت کے ناقابل اعتبار ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے،

تیسری روایت حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے، اس روایت کے آخری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس ٹکڑے کا ذکر آیا تو آپ نے ناگواری کا اظہار فرمایا، فکانہ کرہ ذالک

ایک طرف تو کتاب و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کلام الٰہی کا کوئی حصہ نازل ہوتا تھا تو آپ خود بھی اسے مستحضر کر لیتے تھے، اور فوراً کاتبین وحی کو بلا کر اس کا املا کرا دیتے، اور حاضرین کو سنا کر یا نمازوں میں پڑھ کر اس کا عام چرچا فرما دیتے تھے، اس طرح وہ نازل ہوتے ہی سینکڑوں سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہو جاتا تھا، مگر اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ کلام الٰہی کا کوئی حصہ ایسا بھی تھا کہ آپ نے نہ اسے کسی کو سنایا اور نہ املا کرایا، بلکہ جب آپ سے اس کے لکھوانے کی فرمایش کی گئی تو آپ نے

[1] مستدرک میں ان کا نام ابو امامہ درج ہے، اور فتح الباری میں ابو اسامہ بن سہیل۔

ناگواری ظاہر کی، حالانکہ اس میں ناگواری کی کوئی بات نہیں تھی، آپ یہ فرما سکتے تھے کہ یہ آیت منسوخ ہوچکی ہے،

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جوں ہی اس کا نزول ہوا، حضرت ابن عاص یا حضرت عمرؓ آپ کی خدمت میں گئے (لما نزلت اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے لکھنے کی فرمایش کی مگر آپ نے اس سے انکار فرمایا، آخر کار ایسی آیت کے نزول سے فائدہ ہی کیا تھا جس کی نہ تو ایک دن تلاوت ہی ہوئی اور نہ اس پر ایک دن عمل ہوا؟

اس روایت کا وہ حصہ اور زیادہ قابل غور ہے جس میں اس ٹکڑے کے معنوی نقص پر روشنی ڈالی گئی ہے، حضرت ابن عاص یا حضرت عمرؓ نے زید بن ثابت کو مخاطب کر کے فرمایا، آپ ذرا اس کے مفہوم پر غور کریں، اس میں مطلقاً بوڑھوں کے مرتکب زنا ہونے کی سزا رجم قرار دی گئی ہے خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا نہ ہوں، مگر عمل اس کے خلاف ہے، عمل تو یہ ہے کہ اگر بوڑھا شادی شدہ ہوا تو اس کو رجم کیا جائے گا، اور اگر اس نے شادی نہیں کی ہو اور بڑھاپے میں اس نے اس جرم کا ارتکاب کیا تو اس کو محض سو کوڑے کی سزا دی جائیگی، اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ محض بوڑھے زانیوں ہی کو رجم کیا جائیگا، لیکن عملاً یہ ہے کہ اگر کوئی نوجوان شادی شدہ ہو اور وہ زنا کا ارتکاب کرے تو اس کو بھی رجم کیا جائیگا، مقصد یہ ہے کہ یہ آیت اس لئے منسوخ قرار دی گئی کہ اس میں معنوی نقص بھی ہے اور تعامل کے خلاف بھی، اس بیان سے دو باتیں معلوم ہوئیں،

ایک یہ کہ جن صحابی نے اس پر یہ عقلی اعتراض کیا ہے، ان کے نزدیک کلام الٰہی کے مقابلہ میں تعامل زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اور کلام الٰہی کے منسوخ ہونے کے لیے خلاف تعامل ہونا کافی ہے،

دوسری یہ کہ کلام الٰہی کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جو محض اپنے معنوی نقص کی وجہ سے منسوخ ہوا اور یہ معنوی نقص خدا اور اس کے رسول نے نہیں، بلکہ ایک صحابی نے بتایا، غور کیجئے کہ اس روایت کو تسلیم کر لینے کے بعد ہمیں دین کی کتنی بنیادی باتوں سے دست بردار ہونا اور ان پر تیشہ چلانا پڑے گا،

(باقی)

اسد بیگ قزوینی

(از جناب نذیر احمد صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ)

اسد بیگ قزوینی اکبر کے آخری عہد کی ایک مشہور شخصیت گزری ہے، چنانچہ اس نے عہد اکبری کے آخری تین سالوں کے جو سیاسی اور معاشرتی حالات "وقائع اسد بیگ" میں جمع کر دیے ہیں، وہ تاریخ کے ایک بڑے خلا کو پورا کرتے ہیں، اس کی اہمیت کے پیش نظر گذشتہ چند سالوں میں کتاب مذکور پر بعض فضلا[1] نے مضامین بھی لکھے، مگر ان میں سے کسی ایک مضمون میں بھی اسد بیگ کی فضیلت پوری طرح نمایاں نہیں ہو سکی ہے، زیر نظر مضمون کو ان مضامین کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔

اسد بیگ قزوین[2] کا رہنے والا تھا، چنانچہ خود اس نے "وقائع اسد بیگ" میں اپنے باپ کا نام محمد مراد[3] لکھا ہے، لیکن ڈاکٹر محمد عزیز احمد نے اسی کتاب کے حوالے سے اس کے باپ کا پورا نام محمد مراد بیگ آقا ملائی[4] تجویز کیا ہے، ریو[5] نے محمد مراد کے بجائے خواجہ مراد لکھا ہے، اور بظاہر اس کا ماخذ مراۃ جہاں نما ہے،

[1] ایلیٹ و ڈاؤسن، (ملاحظہ ہو تاریخ ہند ج ۶ ص ۱۵۰-۱۷۴) ریو: فہرست مخطوطات فارسی موزۂ برطانیہ ج ۳ ص ۹۹۹-۱۰۰۰ ڈاکٹر محمد عزیز احمد و انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن ج ۱ ص ۸۷-۹۰ ڈاکٹر پی، ایم، جوشی: پوتدار کمومویشن ص ۱۸۴-۱۹۱

[2] خوشگو نے اس کے حسب و نسب کے بارے میں حسب ذیل اطلاع پہنچائی ہے: ترانی الاصل و از قدیمان سلسلۂ علیہ تیموریہ بودہ (جوشی مینی ز ص ۱۸۴) غالباً ایتھے کو اسی وجہ سے مغالطہ ہوا، اور انھوں نے اس کو آل تیمور سے متعلق بتایا ہے (فہرست بادلی عمود ۴۳۴ نمبر ۹۸) [3] ایلیٹ ج ۶ ص ۱۵۰، ریکارڈس ص ۸۰ (Mulaki

[4] ریو ج ص ۹۹۹ [5] ص ۴۷۷

تذکرۂ میخانہ میں بھی خواجہ مراد ہی ملتا ہے، میخانہ سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسد بیگ نے اپنے وطن ہی میں رشد و تمیز حاصل کی اور ابتدائی تعلیم کی تکمیل بھی قزوین ہی میں ہوئی، ابھی نوجوان ہی تھا کہ شوق سفر خراسان کی طرف لے گیا، ہرات پہنچ کر خواجہ افضل[1] وزیر کا دوات دار مقرر ہو گیا، ہرات اس زمانے میں بھی علم و فضل کا بڑا مرکز تھا، چنانچہ یہاں کے فضلا کی صحبت میں اس کو اپنے جوہر قابلیت دکھانے کا خوب موقع ملا، اور یہیں اس نے مشق سخن بھی جاری کی، میخانہ کے الفاظ یہ ہیں:

"در آں جا (ہرات) با مردم اہل صحبت[2] داشتہ و از صحبت یاراں در مقام انتظام نظم شدہ۔"

ہرات میں کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد ہندوستان کی سیاحت کا شوق غالب ہوا، اور بہت جلد وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوا، اور وہ اکبر کے دربار میں پہنچ کر شیخ ابو الفضل سے متعلق ہو گیا،

اسد بیگ اور ابو الفضل | "وقائع اسد بیگ[3]" سے پتہ چلتا ہے کہ ابو الفضل کے قتل کے وقت اسکی صحبت میں ۱۷ سال گزر چکے تھے، چونکہ قتل کا واقعہ سنہ ۱۰۱۱ھ کا ہے[4] اس لیے اسد بیگ کے ورود ہند کا زمانہ سنہ ۹۹۴ھ کے قریب کا ہوگا، اور اگرچہ عہد اکبری کی کسی معتبر تاریخ میں اسد بیگ کا ذکر نہیں ملتا، لیکن چونکہ وہ براہ راست ابو الفضل کا ملازم تھا، اور شاہی دربار سے اس کو کوئی بڑا منصب نہیں ملا تھا،

[1] ریو (ص ۹۹۵) سے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے، بظاہر مولف مراۃ جہان نما کے سامنے تذکرۂ میخانہ تھا، وزیر مذکور کی شخصیت کا باقاعدہ تعین نہیں ہو سکا ہے [2] ہفت اقلیم میں بھی ہے: اسد بیگ لطف طبع و شگفتگی خاطر و گرمی ہنگامہ موصوف بود، ہموارہ خیال مجالست اہل طبع و اصحاب فہم بر لوح خاطر می نگارد و روزگار بہ شادمانی و ابتہاج می گزارند، مدام مراد وش آنکہ با یارے بہ صحبت نشینند و پیوستہ فکر خاطرش اینکہ با دوستے الفت گزینند۔ (بحوالہ میخانہ ص ۴۵۵ ح) آتشکدہ میں ہے: گویند بسیار اہل صحبت فضا و باعث جمعیت احباب بودہ (ایضاً) [3] ملاحظہ ہو ایلیٹ ص ۱۵۰، ریو ص ۹۹۹، ریکارڈس ص ۸۸، جوشی ص ۱۸۴ [4] احمد علی نے مخزن الغرائب میں اسد کا ورود ہند بعہد جہانگیر بتایا ہے جو بالکل غلط ہے، ملاحظہ ہو سفینۂ خوشگو و ہمیشہ بہار (سپرنگر ص ۱۸۰)، پروفیسر محمد شفیع نے کسی غلط فہمی کی بنا پر ریو کے حوالے سے ورود کا سنہ ۱۰۱۱ ہجری بتایا ہے (میخانہ ص ۴۵۵)۔ اصل میں یہ ابو الفضل کے قتل کا سنہ ہے جیسا کہ ریو نے بھی لکھا ہے، (ریو ۹۹۹)

اس لیے اس کا ذکر نہ ہونا زیادہ تعجب خیز نہیں، لیکن ابوالفضل کے اکبرنامہ اور آئین اکبری میں اسد بیگ
کو جگہ نہ ملنا ضرور موجب حیرت ہے، ایک بات یہ ضرور ہے کہ چونکہ اسد فارسی کا اچھا خاصہ شاعر
تھا، اور فارسی شعرا کے تذکرے میں اس کا برابر ذکر ملتا ہے، اس لیے بدایونی اور طبقات اکبری
کے شعرا کی فہرست میں اس کو جگہ ملنا چاہیے[1]، جبکہ ان دونوں کے بہت ہی قریب العہد تصنیف
تذکرہ ہفت اقلیم (۱۰۰۲) میں اسد کی شاعری کی خاصی تعریف و توصیف ملتی ہے[2]، لیکن اس میں
بھی اسد کے ہندوستان آنے کا ذکر نہیں پایا جاتا، لیکن چونکہ خود اسد کا اپنا بیان موجود ہے[3]، اس
ان تاریخوں کے مکمل ہونے کے قبل اسد کا ہندوستان آنا بہرحال مسلم سمجھا جائے گا،

۱۰۰۶ھ[4] میں اکبر نے ابوالفضل کو دکن کی مہم پر بھیجا، اسد بیگ بھی اپنے آقا کے ہمراہ[5] دکن گیا،
اور وہاں ابوالفضل کے دوش بدوش دکن کے حالات کے سدھارنے میں مصروف رہا، ۱۰۱۱ھ[6]
میں ابوالفضل کو دربار میں حاضری کا حکم ہوا، تو اسد بھی اس کے ہم رکاب آگرہ کی طرف روانہ ہوگیا،
لیکن سرونج[7] تک وہ اپنے آقا کے ہمراہ آیا تھا کہ ابوالفضل نے اس کو اندرجیت بندیلہ سے جنگ کرنے
کے لیے چھوڑ دیا، اور خود گوپال داس کے ساتھ دربار کی طرف روانہ ہوگیا، اگرچہ اسد بیگ بذات خود
اس بات پر اصرار کرتا رہا کہ کم از کم گوالیار تک وہ ابوالفضل کے ساتھ جائے، مگر آخر الذکر کسی طرح راضی نہ ہوا،
اسے خلعت وغیرہ دے کر سرونج ہی میں قیام کرنے کی تاکید کی، شیخ ابوالفضل آگے بڑھا اور سرائے برار[8] پہنچ کر
وہاں خیمہ زن ہوا، تو ایک جوگی نے نرسنگھ بندیلہ کی آمد کی خبر دی، اور یہ بتایا کہ اسکی نیت خراب ہے[9]،

---

۱ بدایونی ۱۰۰۴ھ کی تالیف ہے، طبقات اکبری ۱۰۰۲ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے، اور ہفت اقلیم بھی ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوئی، تصنیف امین احمد رازی
۲ تاریخ نظمی ہے۔ ۳ ملاحظہ ہو نسخہ خطی (لکھنؤ یونیورسٹی) ورق ۹۳ الف ۴ اس کا خاص کام شہزادہ مراد کو آگرہ لانے کا تھا، تاکہ
اسے سمجھا بجھا کر پھر دکن بھیجا جائے (اکبرنامہ ج ۳ ص ۷۴۰) ۵ اگرچہ تاریخوں میں اسد کے جانے کا ذکر نہیں، مگر واپسی کا حال خود وقائع
اسد بیگ میں موجود ہے ۶ تکملہٴ اکبرنامہ ج ۳ ص ۸۱۱ ۷ وقائع اسد بیگ بحوالہ ریکارڈس ص ۸۸ ۸ سرونج سے دو تین میل پر
تکملہٴ اکبرنامہ کے حوالہ سے ایلیٹ نے سرائے بنگر جو گوالیار سے دو منزل پر ہے لکھا ہے (ج ۶ ص ۱۰۰) جبکہ اصل نسخہ میں سرائے بیر ہے (ج ۳ ص ۸۱۱)

دوسرے دن جمعہ تھا، چنانچہ نرسنگھ کے آدمی[1] ابوالفضل کے خیمہ پر حملہ آور ہوئے، شیخ کے ہمراہی سخت
پریشان تھے، ابوالفضل ساتھیوں کے مشورہ سے بھاگنے پر راضی ہوگیا، مگر اتنے میں خود بندیلہ پانچ
سواروں کے ساتھ آپہنچا، لڑائی شروع ہوگئی، شیخ کے ساتھیوں نے جن میں گدائی خان، اس کا
لڑکا، جلال خان، سلیم خان، شیر خان، منصور چابک، محمد خان بیگ وغیرہ تھے، داد مردانگی دی اور
اپنے آقا پر نثار ہوگئے، ایک راجپوت کے ہاتھ سے ابوالفضل بھی سخت زخمی ہوا، مگر راجپوت جبار خان
خیل کے ہاتھوں قتل ہوگیا، گو جبار خان بھی فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، نرسنگھ ابوالفضل کے
پاس آیا، ابھی اس میں جان باقی تھی، بندیلہ نے اپنے دامن سے اس کا منہ پونچھا، کچھ باتیں بھی کرنا چاہیں،
مگر شیخ نے ان کا جواب نہایت حقارت سے دیا، اس کے بعد فوراً اس نے اپنی تلوار سے شیخ کا سر کاٹ لیا[2]،
اسد نے چار روز بعد سرونج میں شیخ کے قتل کی خبر سنی[3]، وہ نرسنگھ کے بھائی اندرجیت سے لڑائی کرنے
کی تیاری میں مصروف تھا کہ شاہی فرمان اس کی طلبی کے لیے آگیا، اور اسے آگرہ جانا پڑا،
ابوالفضل کے دربار سے غیر معمولی وابستگی کے نتیجہ میں لوگ اسے شیخ ابوالفضل کہا کرتے تھے.

---

۱ اکبرنامہ ج ۳ ص ۸۱۱، یہاں اسکا نام بر سنگھ دیو ملتا ہے ۲ اکبرنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرائے برار اور انتری کے درمیان مارا گیا، ان میں تین کوس کا فاصلہ
ہے (ج ۳ ص ۸۱۲)۔ ابوالفضل کی تاریخ قتل، مقام قتل وغیرہ کے بارے میں کافی اختلاف ہے، مترجم اکبرنامہ نے قتل کی تاریخ ۴ ربیع الاول ۱۰۱۱ھ
دی ہے، اور مقام قتل سرائے برار (Bar) سے ایک میل آگے ہے۔ ٹی فین تھلر (Tiefenthaler) نے قتل کی جگہ کا نام دوم گھاٹ دیا ہے
جو بارے سے ایک میل مغرب میں ہے، اور یہ آخری مقام دیتے ہے، ایک مغرب میں واقع ہے، اقبال نامہ میں تاریخ ابتدائے ربیع الاول اور قتل کا سرائے بر
اور انتری کے درمیان تجویز ہوئی ہے۔ وقائع اسد بیگ میں قتل کی تاریخ ۴ ربیع الاول بروز جمعہ دی ہے، مترجم اکبرنامہ کا خیال ہے کہ بر سنگھ ایلیٹ کے اصل
فارسی نسخوں میں لفظ بر سنگھ ہی ہے، حیرت ہے کہ ایلیٹ نے ترجمہ میں نرسنگھ لکھ دیا، اس لیے قاتل کا نام بر سنگھ دیو ہی صحیح سمجھنا چاہیے، (ترجمہ اکبرنامہ ص ۲۲۰ ج ۳)
اس کے برخلاف ایلیٹ میں بر سنگھ کو غلط بتایا ہے، ص ۱۵۶ ج ۶) ۳ ملاحظہ ہو ایلیٹ ج ۶ ص ۱۵۶ ۴ مترجم اکبرنامہ کو صحیح طور پر اعتراض ہے کہ اسد
کو جب قتل کی اطلاع ملی تو اسے قاتلوں کو سزا دینے کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس اس کا سرونج جا کر اندرجیت سے لڑنے کی تیاری
کرنا اسکے خلوص کے منافی معلوم ہوتا ہے (ترجمہ اکبرنامہ ص ۱۲۲۰ ج ۳)

اسد بیگ اور اکبر

شیخ ابوالفضل کے قتل کی خبر سے اکبر کو جو صدمہ ہوا وہ بیان سے باہر ہے، نہ اس نے حجامت بنوائی اور نہ افیون ہی کھائی، برابر نالہ و شیون کرتا رہا، اس وقت دفعۃً اسے اسد بیگ کا خیال آیا، اور حاضرین سے اسد بیگ کے بارے میں دریافت حال کیا، اسی اثنا میں مرزا جعفر بیگ آصف خاں بھی آگیا، اس سے پوچھا کہ اسد علامی کے ساتھ تھا یا نہیں، اس نے جواب دیا کہ وہ سرونج تک ساتھ تھا لیکن شیخ نے اسے مالوہ کے مفتوحہ علاقے کی نگرانی کے لیے دکن کی فوج کے ہمراہ وہیں چھوڑ دیا اور خود نئے آدمیوں کے ساتھ جو مالوہ میں بھرتی ہوئے تھے، گوپال داس نکما کے ہمرکاب روانہ ہو گیا، اسد علامی کا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہ تھا، مگر خود شیخ علامی نے اس کو وہیں ٹھہرنے پر مجبور کیا، بادشاہ نے آصف خاں کو ایک فرمان لکھنے کا حکم دیا کہ اسد بیگ سارا سامان چھوڑ کر اپنے آدمیوں کے ہمراہ فوراً دربار آجائے، اسد اس فرمان پر دربار کی طرف روانہ ہوا، یہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ بادشاہ غلط فہمی کا شکار ہے، اس کا خیال ہے کہ اسد نے اپنے آقا کی حفاظت میں ضروری احتیاط نہیں کی، چنانچہ خود اس نے اپنے کان سے یہ حکم سنا کہ

"اسے حمام میں لے آؤ، میں اپنے ہاتھ سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا"

مگر اسد نے راجہ رام[1] کے توسط سے جو حالات بیان کیے اس سے بادشاہ کو پورا یقین ہو گیا کہ اسد بے قصور ہے، اور اس کو خلعت عطا کیا، پھر اسد نے ابوالفضل کے جواہرات کا وہ بکس پیش کیا جو مرحوم[2] کے ایک وفادار ملازم نے بڑی مشکلوں سے بچا لیا تھا، بادشاہ نے اسد کو یورباشی[3] کے عہدے پر فائز کیا، اور محافظ خانہ[4] کا افسر بھی مقرر کیا، اور ایک بڑی جاگیر[5] بھی عنایت کی۔

---

[1] ایلیٹ ص ۱۵۱، [2] ریکارڈس ص ۱۰۰ جہاں دونوں کی پوری گفتگو درج ہے، [3] ایلیٹ ص ۱۵۱ [4] ریکارڈس ص ۱۰۱

[5] ایلیٹ ص ۱۵۱ [6] ایضاً پرشاد علی خاں کی ضبط کرلی گئی تھی جس سے اسد کو پہلے سال ستر ہزار، دوسرے سال بیس ہزار اور تیسرے سال ... ہزار کی آمدنی ہوئی [7] ایلیٹ ج ۶ ص ۱۵۵ (قتل کا سنہ ایلیٹ میں غلطی سے ۱۰۱۱ھ درج ہو گیا ہے)

اسی درمیان میں رائے رایان کی سرکردگی میں ایک فوج نرسنگھ[1] کی گرفتاری کے لیے روانہ ہوئی، اس فوج نے اسے ایک قلعہ میں گھیر لیا، لیکن وہ نہایت ہوشیاری سے رات کی تنہائی میں نکل بھاگا،[2] اس کی اطلاع جب دربار میں پہنچی تو بادشاہ بہت خفا ہوا، اور اس نے اسد بیگ کو حالات کی تفتیش کیلئے بھیجا، اسد بیگ نے بڑی ہوشیاری سے تفتیش کا کام کیا، اور یہ معلوم ہوا کہ اس میں تمام افسر قصوروار ہیں، اس کے بھاگ جانے کی ذمہ داری کسی ایک شخص پر عائد نہیں ہو سکتی،[3] اس تحقیقات کے بعد اسد بیگ اور بادشاہ سے جو گفتگو ہوئی، اس سے اس کے کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے،[4] بادشاہ نے پوچھا، اس میں کس کا قصور تھا، اسد نے واقعات کی تفصیل عرض کرنا چاہی، مگر بادشاہ حالات معلوم کرنے کے لیے اس درجہ بیقرار تھا کہ اس نے پھر وہی پہلا سوال کیا، اسد نے جواب میں عرض کیا کہ اس کے خیال میں کسی سے جان بوجھ کر غلطی نہیں ہوئی، یہ ایک بڑی چوک کا نتیجہ ہے، جس میں سب شامل ہیں، شیخ فرید نے کہا کہ چوک بھی تو قصور ہے، اسد نے جواب دیا، قصور اور خطا میں نیت کو دخل ہوتا ہے، مگر جو غلطی غفلت کی وجہ سے ہو جائے اسے چوک کے علاوہ اور کچھ نہ کہیں گے، گفتگو کا سلسلہ اور بڑھتا مگر بادشاہ نے اسکو ختم کرتے ہوئے کہا کہ اسد کا خیال بالکل صحیح ہے، جس انداز میں اس نے یہ کہا، اس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ اسد کی باتیں اور اس کا طرز استدلال بادشاہ کو بہت پسند تھا، اور اس نے اسد کے درجات میں مزید اضافہ کیا۔[5]

اسد کی بیجاپور روانگی

اکبری دربار میں اسد کا درجہ روز بروز بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اسے دکن کی سفارت پر مامور کیا گیا، ۱۰۰۹ھ میں ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور نے اپنی لڑکی بیگم سلطان[6] کو شہزادہ دانیال

---

[1] ریکارڈس ص ۸۹ [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ایلیٹ ص ۱۶۰ [3] ایضاً، اسد کے ہمراہ اس کا ایک عزیز محمد خان تاتار بھی تھا [4] ایضاً ص ۱۶۲ [5] ایلیٹ (ص ۱۵۲) نے لکھا ہے کہ اس کام کو خوش اسلوبی سے پورا کرنے کے صلہ میں اس کو Treasurer of offerings کے عہدہ پر فائز کیا تھا [6] اسکا نام سلطان بیگم بھی دیا ہے (فرشتہ ج ۲ ص ۱۷۱، بساتین ص ۲۵۵)

کے نکاح میں دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔[1] اس لیے اکبر نے میر جمال الدین حسین انجوے شیرازی[2] کو اس کام
کیلئے بیجا پور بھیجا، مگر اس میں غیر معمولی تاخیر ہوتی گئی، جو چند وجوہ سے بہت مضر تھی[3]، بادشاہ کو میر جمال [illegible]
کی غیر معمولی تاخیر سے بڑی بدگمانی تھی، اسد بیگ کو بیجا پور روانہ کرنے کا مقصد اول یہی تھا کہ وہ میر [illegible]
کو پورا کر کے جلد سے جلد دربار واپس ہو جائے، اسلیے بہت جلد سامان سفر تیار ہو گیا، شاہی وزیر مرزا غیاث بیگ[4] نے مصارف
کے لئے بیس ہزار روپے منظور کئے، اور اسد ۱۰۱۳ھ میں اپنے سفر پر روانہ ہوا، اجین میں مرزا شاہ رخ[5] سے ملا، وہاں سے برہان پور گیا، پھر
بیجا پور کی طرف رخ کیا، منگلبیرہ[6] کے قریب پہنچا تھا کہ میر جمال الدین اور بیجا پور کے چند افسروں نے جن میں
مصطفےٰ خاں، ہیبت خاں اور رومی خاں قابل ذکر ہیں، استقبال کیا، اور شام کو وہ منگلبیرہ پہنچ گیا،
اور میر جمال الدین کے ساتھ چند دن قیام کیا، ایک روز ابراہیم عادل شاہ کی لڑکی[7] نے اسد بیگ
اور میر مذکور کو آخر الذکر کے حکم سے مدعو کیا، دعوت میں بڑی خاطر مدارات ہوئی، واپسی پر طرح طرح کے
تحائف ملے، جن میں قیمتی جواہرات کے علاوہ ایک بیش قیمت ہاتھی اور دو نہایت عمدہ عربی گھوڑے بھی
تھے، عادل شاہی امرا نے بھی تحائف کی پیش کش کی، ابراہیم عادل شاہ کی خواہش[8] یہ تھی کہ اسد ابھی
عجلت نہ کرے، اس کے لیے اس نے طرح طرح کی شکلیں اختیار کیں، مگر اسد نے ایک نہ سنی، بالآخر
عادل شاہ نے اسد کو بیجا پور آنے کی دعوت دی، وہ دوسری[9] شعبان ۱۰۱۳ھ کو شہر کے قریب پہنچ گیا

[1] اکبر نامہ (ج ۳ ص ۸۰۰، ۸۲۳، ۸۲۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ابراہیم عادل شاہ کی طرف سے پیغام بھیجا گیا تھا، مگر فرشتہ اور بساتین [illegible]
ہوتا ہے کہ اکبر بادشاہ کی ذاتی تجویز تھی (فرشتہ ج ۲ ص ۹۰) سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کا پہلا لڑکا ۱۰۰۸ھ میں پیدا ہوا تھا، اس لحاظ سے اگر [illegible]
اسکی سب سے بڑی لڑکی ہوگی تو بھی اسکی عمر ۵ سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی) [2] ایلیٹ ج ۶ ص ۱۴۲ جوشی ص ۱۸۵ آئین ج ۱ ص ۵۰۱ فرشتہ ج ۲ [illegible]
اکبر نامہ ص ۸۰۵ وغیرہ۔ میر جمال الدین فرہنگ جہانگیری کا مولف ہے، اکبر کے عہد میں بڑے بڑے عہدہ جلیلہ پر فائز رہا، اسکے حالات کے لیے ملاحظہ ہو
آئین اکبری ج ۱، مآثر الامراء ج ۱ وغیرہ [3] اکبر کی بھیجنی سے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً شادی کی تجویز اسی کی طرف سے ہوئی ہوگی [4] جوشی ص ۱۸۰
[5] بکار، ڈس ص ۹۰ [6] جوشی ص ۱۸۰ [7] جوشی ص ۱۸۰-۱۸۸، اس وقت بھی لڑکی کی عمر ۱۲ سال سے کم ہی ہوگی، اس کا [illegible]
بیجا پور سے باہر منگلبیرہ میں میر جمال الدین کی نگرانی میں مقیم رہنا کچھ حیرت خیز معلوم ہوتا ہے [8] ایضاً [9] ایضاً ص ۱۸۹

مگر احباب کے مشورے سے ۱۳ دن قیام کر کے شب برات کے بعد بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونا مناسب
خیال کیا، اس قیام کے دوران میں دو عادل شاہی رکن سلطنت روزانہ اسد بیگ کی خدمت میں آتے،
ان کے علاوہ مولانا ملک قمی[1]، مولانا ظہوری[2] اور میر معین الدین بھی پابندی سے آتے جن کی صحبت
میں اسد بے حد مسرور و محظوظ ہوتا، ۷ شعبان[3] کو سلطان سے ملاقات کی تاریخ مقرر ہوئی، اسد کو
جھیل کے کنارے ایک پر فضا محل میں اتارا گیا، اس نے ابراہیم عادل شاہ کو اکبر کا فرمان دیا، سلطان
نے ضروری تعظیم و تکریم کے ساتھ اسے لیا اور شاہنواز خاں[4] نے اسے پڑھا جس کا آخری حصہ یہ تھا
کہ "جو کچھ اسد بیگ سلطان کی خدمت میں زبانی عرض کرے، اس پر فرمان سمجھ کر عمل ہونا چاہیے،
اور جو کچھ والی بیجا پور کو کہنا ہو اسے بھی اسد سے کہدیا جائے، اس پر عمل ہوگا، اس سے ہر بات پوست کندہ
کہی جانی چاہیے، اور میر جمال الدین کو واپس کرنے میں کسی قسم کا توقف نہ ہونا چاہیے، تاکہ وہ اس کے
ساتھ دربار میں حاضر ہو سکے"۔

ابراہیم عادل شاہ کی خواہش تھی کہ اسد بیگ کچھ دن اور بیجا پور میں قیام کرے، وہ صرف[5]
اس شرط پر راضی ہوا کہ سلطان اپنا محبوب ہاتھی چنچل[6] طلائی زیور سے آراستہ کر کے دربار اکبری میں
پیش کش کرے، وہ اس کے لیے آمادہ ہو گیا، چند دنوں میں تقریباً دس من سونے کا زیور تیار ہوا،
اور اسد بیگ کی روانگی کا وقت آ گیا، بادشاہ نے ایک سیاہ عربی گھوڑا جس کی قیمت تین ہزار ہون[7]
تھی، مزید پیش کش کیا، ۲۷ شعبان کو اسد بیگ شاہی محل[8] میں مدعو کیا گیا، محفل رقص و سرود بھی گرم ہوئی،

[1] ظہوری کا خسر تھا [2] ظہوری صاحب سہ نثر ظہوری [3] جوشی ص ۱۹۰ [4] ایضاً ص ۱۹۱، نیز ملاحظہ ہو ایلیٹ ص ۱۶۳
[5] جوشی ص ۱۹۲ [6] اسد بیگ نے چنچل اور گراناباری لڑائی کا ذکر وقائع میں کیا ہے، اس لڑائی میں کوئی بات ایسی ہوگئی جو اکبر
کو ناپسند تھی، اس کے چند ہی دنوں بعد اکبر کا سانحہ ارتحال بھی ہوا (ایلیٹ ج ۶ ص ۱۷۰) جہاں گیر نے بھی ایک ہاتھی کو جو ابراہیم نے دیا تھا اسکی خدمت
میں پیش کیا، اس ہاتھی کا پہلا نام بخت بلند تھا (تزک ج ۱ ص ۱۹۹) [7] جوشی ص ۱۹۲

اس میں بادشاہ اس درجہ محو تھا کہ اسد کے سوالات کے جواب بھی نہیں دیتا تھا، اسی اثنا میں سلطان کی نظر اسد بیگ کی شصت مریدی[1] پر پڑی، وہ اسد کو گروبھائی کہتا تھا، چنانچہ شصت مریدی اسد سے لیکر خود اپنے کو بادشاہ کا مرید کہنے لگا، اسد اس کو کسی حال میں الگ نہیں کرنا چاہتا تھا، ابراہیم نے اسے اس شرط پر واپس کیا کہ وہ اس کے لیے جلد سے جلد ایک دوسری شصت مریدی بھیجے گا،

اسد بیجاپور سے ۲ر رمضان کو منگلبیرہ روانہ ہوا، اور یہاں مختصر قیام کے بعد شہزادی، میر جمال الدین حسین اور دوسرے ہمراہیوں کے ساتھ احمد نگر پہنچا، مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ بھی شہزادی کے ہم رکاب تھا، جب یہ لوگ احمد نگر پہنچے تو شہزادہ دانیال نے اسد بیگ کی کامیابی پر مبارکباد پیش کی، باغ فرح بخش میں ایک شاہانہ جشن[2] ترتیب دیا گیا، جس میں شہزادے نے اسد بیگ کو خلعت، عراقی گھوڑا اور دوسرے تحائف عطا کیے، اس کے بعد اسد بیگ آگرہ روانہ ہوا،

ان ہی ایام میں مریم مکانی[3] کی وفات کی وجہ سے بادشاہ اور تمام ارکان دولت نے بال منڈوا دیئے[4]

[1] یہ نشان اخوت تھا جو دین الٰہی کے تمام پیرو پہنتے تھے، اس پر "اللہ اکبر" کا فقرہ کندہ تھا، آئین اکبری میں ہے، "و شصت خاصہ کہ بردا سم اعظم و علم اقدس "اللہ اکبر" نقش کردہ اند بدو (بہ مرید) سپارند و این معنی تلقین یابد: شصت پاک و نظر پاک خطائے نہ کند"، مزید ملاحظہ ہو نزک جہانگیری ج ۱ ص ۶۰-۶۱، و رائے چند چودھری، دین الٰہی ص ۸۶، ۸۷ [2] گو ابھی باقاعدہ شادی کے رسوم پورے نہیں ہوئے تھے، اور اس جشن کا تعلق جشن شادی سے نہ تھا، باقاعدہ شادی صفر ۱۰۱۳ھ میں گوداوری کے کنارے عمل میں آئی، اس وقت بادشاہ نے ایک سکہ جاری کیا جس کے ایک رخ پر رام اور سیتا ناگری حرفوں میں نقش ہے اور دوسری طرف ایک شہزادہ معہ تیر و کمان کے ایک برقع پوش خاتون کے ہمراہ نظر آرہا ہے، ملاحظہ ہو جوشی ص ۱۹۵ متن و حاشیہ [3] ملاحظہ ہو اکبر نامہ ج ۳ ص ۸۳۰-۸۳۱، مریم مکانی کا انتقال ۱۹ شہریور مطابق ۲۹ اگست ۱۶۰۴ء کو ہوا یعنی جلوس اکبری کے ۴۹ ویں سال جو ۱۰ر شوال ۱۰۱۲ھ مطابق ۱۱ر اپریل ۱۶۰۴ء سے شروع ہوا تھا، گویا شروع ہونے کے ۵ ماہ ۱۲ دن بعد، اس لیے اس واقعہ کی تاریخ ربیع الاول ۱۰۱۳ھ ہوگی، اس لحاظ سے زبدۃ التواریخ کی تحریر کردہ تاریخ یعنی ۱۰۱۲ھ غلط ہے، نیز ملاحظہ ہو ترجمہ اکبر نامہ ص ۱۲۴۵ و ۱۲۴۶ [4] اس رسم کو بھدرا کہتے ہیں، ملاحظہ ہو رکارڈس ص ۹۸ متن و حاشیہ

اس لیے اسد نے بھی اس پر عمل کیا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اکبر کو دکن کے تحائف بے حد پسند آئے، ان تحائف میں تمباکو[1] بھی تھا، بادشاہ نے شاہی معالج کی مرضی کے خلاف اس کو پیا، اس وقت خان اعظم[2] بھی موجود تھا، حکیم موصوف تمباکو کی برائی کیا کرتا تھا، مگر اسد بیگ نے اس طرح اس کی توصیف کی کہ خود بادشاہ کو اسد بیگ کا طرز استدلال بہت پسند آیا اور چند روز میں تمباکو کی شہرت دور دور تک پھیل گئی، مگر بادشاہ نے اس کو اپنے معمولات[3] شامل نہیں کیا،

اسد بیگ کی سفارت دکن بار دوم

اس کے بعد اکبر نے اسد بیگ کو بیجاپور، گولکنڈہ، بیدر اور کرناٹک کی سفارت[4] کے لیے نامزد کیا، اور اس سے کہا کہ جب وہ پہلی مرتبہ میر جمال الدین کو لینے گیا تھا تو بہت عجلت تھی، اس لیے وہاں قیام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، اب کی بار اطمینان سے اور جتنا اس کا جی چاہے قیام کر سکتا ہے، بادشاہ کی خواہش صرف یہ ہے کہ وہاں جتنے قیمتی جواہرات اور بیش قیمت ہاتھی دستیاب ہو سکیں ان کو جمع کر لیا جائے، خود اس کی خواہش کا یہ عالم تھا کہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جب تک دکن میں ایک عمدہ ہاتھی اور کوئی قیمتی جواہر باقی ہے، اس وقت تک اسے اپنے کام سے باز نہ آنا چاہیے، اس کے بعد اسد بیگ نے سفر کی تیاری شروع کی، اگرچہ وہ دو سو[5] سواروں کا افسر تھا، مگر اس نے چھ سو عراقی، خراسانی اور ترکستانی سواروں کا دستہ اپنے ساتھ لیا اور ہر سوار کو ایک عمدہ گھوڑا دیا، اور تین چار مہینے کی پیشگی تنخواہ بھی دیدی، شاہ علی اصفہانی کو بخشی مقرر کیا، اور چند دوسرے محافظ اور تیر اندازوں کے ساتھ دکن روانہ ہو گیا، راستے میں اس کو راجہ بھوج[6] کے آدمیوں سے لڑنا پڑا، اور اس میں کامیابی کے بعد اپنا سفر جاری رکھا، اجین پہنچ کر شاہ رخ کے ساتھ چار دن قیام کیا، اسی درمیان میں بادشاہ کے انتقال کی خبر آگئی، مگر اس نے سفر جاری رکھا،

[1] رکارڈس ص ۹۸ [2] ایلیٹ ص ۱۶۵-۱۶۷ [3] بزم تیموریہ میں ہے کہ بیجاپور سے واپسی کے بعد اسکو شاہی حاجب مقرر کیا گیا اور ساتھ ہی منصب اور تین ہزار روپے کا وظیفہ بھی مقرر ہوا (ص ۱۲۲) [4] ایلیٹ ص ۱۶۵-۱۶۷ [5] ص ۱۶۸ [6] رکارڈس ص ۹۰

راستے میں شاہ علی بخشی نے اس کو بڑی تکلیفیں پہنچائیں، مگر بالآخر شاہ رخ کی حمایت سے وہ برہان پور پہنچ گیا، وہاں کے حاکم خواجہ ابوالحسن نے بڑی عزت و تکریم کی، اسی اثنا میں جہانگیر کی تخت نشینی کی خبر ملی، جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے چند ہی دن بعد اسد بیگ کو واپس بلا کر اس کو عہدے سے معزول کر دیا،

اسد بیگ اور جہانگیر

اسد بیگ شاہی فرمان کے مطابق واپس آیا تو بادشاہ کو بے حد خفا پایا، اس نے اعلان کر دیا کہ اسد بیگ کو کسی عہدہ پر مامور نہیں کیا جا سکتا، اس کا جی جہاں[1] چاہے چلا جائے، مگر ڈاکٹر عزیز[2] کا بیان ہے کہ

> اسد بیگ کو جہانگیر کے دربار میں حاضری کا حکم صادر ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اور دوسرے امرا جو ابراہیم عادل شاہ کے حالات دریافت کرنے کے لیے بیجا پور بھیجے گئے تھے، وہ اکبر کے سانحۂ ارتحال اور جہانگیر کی تخت نشینی کی اطلاع پا کر آگے نہیں بڑھے اور آگرہ واپس ہو گئے، لیکن اسد اطلاع پانے پر بھی برہان پور چلا گیا، بہر حال اسد جہانگیر کے سامنے حاضر ہوا، اور امیر الامرا شریف خاں[3] کی سفارش پر اسے معاف کر دیا گیا۔"

لیکن باوجود معزولی کے اسد بیگ کی اطاعت و فرماں برداری میں کوئی فرق نہیں آیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر بادشاہ کی ناخوشی ختم ہوئی، اور اسے دربار میں اعزاز حاصل ہو گیا، اور پیشرو خان[4] کے معزز لقب سے سرفراز ہوا، مگر ڈاکٹر عزیز نے وقائع ہی کے حوالے سے اس کا خطاب مشرف خاں[5] لکھا ہے،

[1] ایلیٹ ص ۱۵۰، [2] رکارڈس ص ۹۰، [3] اسد بیگ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر نے اسے یہ خطاب عطا کیا تھا، (ایلیٹ ص ۱۷۳) [4] ایلیٹ ص ۱۵۰، ریو ص ۹۷۹، جوشی ص ۱۰۴، نشتر عشق بحوالہ حواشی میخانہ ص ۹۶۔ ان سب بیانات کے مطابق آخری زمانے کا یہ خطاب تھا، مگر اکبر کے زمانے میں دکن میں ایک پیشرو خاں کا خطاب یافتہ تھا، جس کو مترجم اکبر نامہ نے اسد بیگ ہی خیال کیا ہے (ملاحظہ ہو اکبر نامہ ج ۳ ص ۸۰۰، و ترجمہ ص ص ۱۱۲۵ حاشیہ ۱) [5] رکارڈس ص ۸۰

تذکرہ میخانہ میں دربار جہانگیری سے معزولی کا ذکر بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، اس کا بیان ہے کہ اکبر کی[1] وفات کے بعد جہانگیر نے اسے اپنے بندگان میں داخل کر لیا تھا، مگر اسد کے ذاتی بیان کے مقابلے میں مولف میخانہ کا بیان قابل قبول نہیں ہو سکتا،

میخانہ میں[2] ہے کہ اس کا مولف (ملا عبد النبی قزوینی فخر الزمانی) ۱۰۲۶ھ میں اسد بیگ سے جو اس کا ہم وطن تھا، سندھ میں ملا تھا، اور اسی سال جہانگیر نے اسے زمانہ بیگ مہابت خان[3] کے پاس بنگش بھیج دیا تھا، مگر صحف ابراہیم[4] سے پتہ چلتا ہے کہ عہد جہانگیری میں مرزا جعفر بیگ آصف خاں کے وسیلے سے وہ کابل کا وزیر بخشی مقرر ہو گیا تھا، چونکہ آصف خاں، اسد بیگ کا عزیز[5] اور ہم وطن تھا اور اس نے مختلف موقعوں پر اسد کی حمایت کی تھی خصوصاً ابو الفضل کے قتل کے بعد دربار میں حاضری کے لیے فرمان بھیجنے کے موقع پر، اس لیے اس کے توسط سے اسد کا کابل کا بخشی مقرر ہو جانا قرین قیاس ہے، اور جب خود میخانہ کے بیان سے اس کا اطراف کابل (بنگش) جانا ثابت ہے۔

اسد بیگ کی وفات

ایلیٹ[6] نے اسد بیگ کی وفات کا زمانہ ۱۰۴۱ھ یعنی ابتدائے عہد شاہجہانی بتایا ہے، اور ریو وغیرہ[7] نے بھی اس کی تائید کی ہے، سفینۂ خوشگو[8] میں اوائل زمانہ شاہجہاں (بلا قید تاریخ) بتلایا گیا ہے، اس میں یہ بھی ملتا ہے کہ توران میں اس کی وفات ہوئی تھی، مگر ریو[9] نے مراۃ جہاں نما کے حوالے سے سنہ وفات ۱۰۳۱ھ دیا ہے، جس کی تغلیط یا تصحیح کا کوئی قرینہ ہمارے پاس نہیں ہے، البتہ مولف میخانہ سے اسد بیگ کی ملاقات[10] ۱۰۲۶ھ میں ہوئی ہے اور اسی کے یہاں سے ۱۰۲۸ھ تک اس کا بقید حیات ہونا واضح ہے

اس کی تالیفات

تذکرہ میخانہ[11] نے اس کی حسب ذیل تصنیفات کا پتہ دیا ہے:۔

[1] ص ۵۵، [2] ایضاً، [3] عہد جہانگیری کا ایک نہایت ممتاز امیر اور شعرا و فضلا کا نہایت قدر دان تھا، اسکی قدر دانی کیلئے ملاحظہ ہو میخانہ ص ۴۶۱، ۴۸۱، ۵۵۱، ۵۳۱، ۲۳۶، ۲۴۷، ۳۶۹، ۴۱۲، ۴۱۳، ۵۰۳، ۵۵۱، ۵۵۵، ۵۶۲۔ اس کا لڑکا مرزا امان اللہ بھی شعرا کا بڑا قدر دان تھا [4] نسخۂ اندر آغا ص ۳۴ [5] جوشی ص ۱۸۶، حاشیہ ۲ اسکے حالات آئین اکبری اور مآثر الامرا وغیرہ میں درج ہیں [6] ص ۱۴۴ [7] ص ۹۷۹، جوشی ص ۱۰۴، [8] میخانہ ص ۵۵ [9] ص ۹۷۹ [10] میخانہ ص ۵۵ [11] ایضاً

(۱) دیوان مشتمل بر ۸ ہزار ابیات (۲) مثنوی در بحر مخزن و خسرو شیریں،

دیونٹے[1] مرأۃ جہاں نما کے حوالے سے دیوان کے اشعار کی تعداد بھی لکھی ہے، اور اس کو چند مثنویوں کا مصنف بھی بتایا ہے، مگر ان کے نام نہیں لکھے ہیں، اس کے مقابلہ میں صحف ابراہیم[2] میں اس کے اشعار کی تعداد ۲ ہزار بتائی گئی ہے، ہفت اقلیم[3] میں اسد بیگ کی غزلیات و رباعیات کے چند اشعار لکھے ہیں جو اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اس کا کلام ایک ہزار دو ہجری (۱۰۰۲) کے قبل مدون ہو چکا تھا،

(۳) وقائع اسد بیگ - یہی وہ کتاب ہے جس کی دریافت نے اسد بیگ کی شخصیت کو کسی قدر نمایاں کیا ہے، چنانچہ اس مضمون میں کئی جگہ اس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کے چند نسخے مختلف کتب خانوں میں وقائع اسد بیگ، احوال اسد بیگ، حالات اسد بیگ اور تاریخ مغل کے نام سے پائے جاتے ہیں، یہ عہد اکبری کے آخری تین سال کے واقعات کی ڈائری ہے، اس کے خاص موضوع یہ ہیں:

(۱) قتل ابوالفضل

(۲) تفتیش حالات عاملاں برائے گرفتاری و سزا رسانی نرسنگھ بندیلہ،

(۳) سفارت بیجاپور و حالات بیجاپور و ابراہیم عادل شاہ وغیرہ،

(۴) واپسی اسد بیگ بدربار اکبری،

(۵) روانگی اسد بیگ بہ سفارت حکومت ہائے دکن،

(۶) وفات اکبر اعظم،

(۷) تخت نشینی جہانگیر،

ان تمام موضوعات پر اسد بیگ نے جو تفصیلات درج کی ہیں وہ بے حد دلچسپ اور معتبر ہیں اور غالباً ان میں سے اکثر موضوع پر یہ سب سے اچھا ماخذ بھی ہے، چنانچہ الیٹ نے بھی اس کو تاریخ کا ایک

[1] ص ۹۰، [2] ص ۴۳، [3] نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی ص ۴۳۹

اہم ماخذ تصور کیا ہے، اور بنگال سول سروس کے بی ڈبلو چیپ مین سے اس کا انگریزی ترجمہ بھی کرایا تھا، وقائع اسد بیگ کے حسب ذیل نسخوں کا پتہ چلا ہے،

(۱) نسخۂ الیٹ

(۲) نسخۂ کتاب خانہ موزۂ برطانیہ (بعنوان احوال اسد بیگ)

(۳) نسخۂ کتاب خانہ سرکاری (رضا لائبریری)، رام پور جس سے سر جادو ناتھ سرکار نے ایک نقل کرائی ہے،

(۴) نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، بعنوان تاریخ مغل، کاتب محمد نذیر الدین (منقول عنہ نسخہ ملکیت تلسی داس ترقیمہ ۱۱۹۹ھ) تاریخ کتابت ۱۸ مئی ۱۹۰۱ء برائے نواب عبد السلام خان خط نستعلیق، سائز ۶×۱۰، ۱۴ سطری،

اسد بیگ کی شاعری

اسد بیگ بظاہر ایک پختہ مشق شاعر معلوم ہوتا ہے، جس کا دیوان خود اس کی زندگی کے وسط میں مدون ہو چکا تھا، اسد[1] اس کا تخلص تھا، اور ابھی جوان ہی تھا کہ وہ شاعری کے میدان میں گامزن ہو گیا، تذکرہ ہفت اقلیم جو اس کی وفات سے ۲۹ سال قبل مکمل ہوا ہے، اس میں اسد کی شاعری کے بارے میں یہ اظہار[2] خیال کیا گیا ہے،

اگرچہ صدف ہائے[3] لجۂ اندیشہ ات بے غش و ثمین در خستان بوستان خاطرش خالی از رطب و یابس نیستند اما آنچہ بکمال رسیدہ

با ذوق تر از خوبان است در ہنگام معانقہ با شوق تر از لفظ محبوبان در وقت مضائقہ۔

مگر مبتلا[4] کا قول یہ ہے "کلامش سراپا درد و سوز است"۔ احمد علی سندیلوی[5] اور ابراہیم خلیل[6] دونوں نے "شاعر خوش بیان" قرار دیا ہے، لیکن فخر الزمانی کا بیان اس بارہ میں مولف ہفت اقلیم کے خیال سے کسی قدر مشابہ ہے، مگر یہ بھی خیال میں رکھنا چاہیے کہ فخر الزمانی کا تذکرہ ہفت اقلیم سے ۲۶ سال بعد

[1] مثلاً ملاحظہ ہو صحف ابراہیم ص ۴۴، [2] ہفت اقلیم ورق ۴۳۹ (۱)، [3] بحوالۂ میخانہ ج، ص ۵۵۵، [4] ایضاً، [5] صحف ابراہیم ص ۴۴

مرتب ہوا ہے، اس کا بیان[1] یہ ہے:

مسودۂ ایں اوراق با او در سنہ دو در سن اربعت عشرین و الف ملاقات واقع شد و دیوانش را ملاحظہ نمودہ قریب ہشت ہزار بیت باشد۔ پارۂ مثنوی در بحر مخزن و خسرو شیریں گفتہ ولیکن چند سے در آں منظومات کار نہ ساختہ است۔"

بظاہر آخری جملہ جس میں اسد کی شاعری کے متعلق اظہار خیال ہوا ہے، صرف اس کی مثنویوں کے بارے میں ہوگا، اس قیاس کی تائید مزید اس بات سے ہوتی ہے کہ میخانہ کے دوسرے نسخے[2] میں منظومات کے بجائے لفظ نظم آیا ہے، اس لحاظ سے میخانہ کے مؤلف کی ناپسندیدگی کا تعلق اس کی غزلوں سے نہیں ہے،

چونکہ اس کے کلام کا نمونہ پوری طرح ہمارے سامنے نہیں ہے، اس لیے ہم تذکرہ نویسوں کے قول کی تائید یا مخالفت میں کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتے، البتہ چند اشعار جو تذکروں میں منقول ہیں، ان سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ یقیناً ایک خوش فکر شاعر تھا، ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

دوست کی محبت جب عاشق کے رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے، تو اس کی یاد سے عاشق کا دل حسن و شگفتگی کا سرچشمہ (یوسفستان) ہو جاتا ہے،

بہر تو جائے کند چوں برگ در یشۂ ما[3] — یوسفستان شود از یاد تو اندیشۂ ما

عاشق کے نزدیک اس کا خون کوئی قیمت نہیں رکھتا، اور اس پر دوست کو ہر طرح کا اختیار حاصل ہوتا ہے، لیکن عاشق کو اپنی خونریزی کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی کہ دوست کی شرمندگی جس کی تاب لانا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا،

خون مرا مریز کہ ترسم خجل شوی[4] — چوں ساقی کہ ریختہ باشد شراب را

[1] میخانہ ص ۵۵۵ [2] ایضاً ص ۵۵۵ نمبر ۵ [3] صحف ابراہیم ص ۳۴۳ و ریاض الشعراء ورق ۲۹ ب
[4] صحف و ہفت اقلیم ورق ۳۴۹ الف

مرحلۂ عشق کی دشواریاں ملاحظہ ہوں،

در مرحلۂ عشق کہ خاکش ہمہ خون است[1] — صد قافلہ گم گشت و صدائے جرسے نیست

عاشق نالہ کرتا ہے، مگر اس نالہ و شیون میں بھی وہ اخفاے راز میں کامیاب ہو جاتا ہے،

نالم و خلقے در آزار اند از نالیدنم[2] — لیک شادم چوں نمی دانند کز آزار کیست

حافظ کو اپنے اس سفر میں جو بیوفائی کا شائبہ نظر آرہا تھا، اسے اسد نے تین صدی سے زیادہ کے بعد رفع کیا،

عیب پیراہن دریدن می کنندم دوستان — بے وفا یارم کہ پیراہن ہمی دارم نہ پوست (حافظ)

چاک ہاے سینہ تا دامن رساند کار من — سینہ کاویدن مگر سوراخ کردہ کار کیست[3]

اس شعر میں اسد نے اپنے خون کے مقابلہ میں شراب کو کس خوبی سے ترجیح دی،

خون مرا بریز و شراب مرا مریز[5] — یک قطرہ زیں شراب بصد خوں برابر است

عاشق کی ہر لمحہ کی جانکاہی ملاحظہ ہو

بیمار محبت ہمہ دم در سکرات است[6] — او را نفس پیش و دم باز پسے نیست

عاشق محبوب کی دشمنی کی کتنی لطیف توجیہ کرتا ہے،

دوست می دارم من او را گرچہ با من دشمن است[7] — دشمن است اما نہ بر آئین دشمن دشمن است

عاشق کو صرف ایسے دیار سے تعلق خاطر ہو سکتا ہے، جہاں سینہ مجروح و نشتر کی گفتگو ہوتی ہے،

بداں دیار دل ما بہ سیم و زر نرود[8] — کہ حرف سینہ مجروح و نیشتر نرود

محبوب کو عاشق کی دل آزاری سے بچنے کی شاعرانہ توجیہ یہ بیان کرتا ہے،

دلم کاہستہ شد راحت بہم مشکن پر و بالش[9] — مبند دسخت صیدے را کہ صیادش زبوں گیرد

[1] صحف و ریاض [2] ایضاً [3] ایضاً [4] در اصل ان دونوں شعروں میں موازنہ مقصود نہیں، حافظ کا شعر اسد کے شعر سے بر محل بلند ہے۔ [5] ریاض الشعراء [6] ایضاً [7] ہفت اقلیم [8] ایضاً [9] ایضاً

شراب کی تری سے نگاہوں میں وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے ساغر بھر سکتے ہیں،

سرمہ در چشمش نمی گنجد ز بس گرمے تر است[1]
ساغرے از نگاہش می تواں لبریز کرد

خیال میں اصل کی کیفیت حاصل کر لینا صرف عاشق کا کام ہے،

ہر گہ خیال آں گل خود روے می کنم[2]
دل می کند خیال کہ گل بوے می کنم

عاشق کے لیے اس کی مرضی کوئی چیز نہیں، وہ دوست میں گم ہو جانا عشق کا کمال سمجھتا ہے،

گر دوست بیوفا است مرا با وفا چہ کار[3]
طورے کہ خوے او ست بداں خوے می کنم

آشنائی بیگانہ میں جو لطف ہے وہ آشنا سے بھی بیان کرنے کے لائق نہیں،

با ہیچ آشنا نہ تواں درمیاں نہاد[4]
ذوقے کز آشنائی بیگانہ بردہ ایم

نامرادی میں شادمانی کی کیفیت حاصل کرنا کمالِ عشق کی دلیل ہے،

ہزار بند شکستیم و باز در بندیم[5]
بیک مراد نہ پیوستہ ایم و خرسندیم

میخانۂ عشق میں آنے کی تلقین

بیا بہ میکدۂ عشق دیدہ را وا کن[6]
بداں چہ مردہ ای اندر غمش تماشہ کن

اپنی خونریزی کی حسن تعلیل

بحشر نام شہیدان دوستی بالا ست[7]
بریز خونم و نامم بحشر بالا کن

ایک نادر تشبیہ

مریز گل بکنارم کہ یاد آں دہدے[8]
کہ پارہ ہاے جگر در کنار داشتمے

اخلاقی تعلیم ملاحظہ ہو

---

[1] صحف ابراہیم و ریاض الشعراء، [2] ایضاً [3] ایضاً [4] صحف ابراہیم [5] ہفت اقلیم [6] ایضاً
[7] صحف ابراہیم و ہفت اقلیم [8] ہفت اقلیم

در جہاں ہر چہ کمی باید ہست[1]
سخن ست ایں کہ چنیں بایستے

در نہم پاے فضولی بمیاں
ہمہ عالم بہ ازیں بایستے

رباعیوں کا نمونہ حسب ذیل ہے،

طبع ست ترا کز دو ارم می جوشد[2]
دستے است ترا کز دو ورم می جوشد

زبان کف چو آفتابے کردم
کز گرمی بخشش و کرم می جوشد

خواہم عدمے کہ پیش ازیں داشت وجود[3]
کین ہستی ہیچ را در رہ راہ نبود

ورنہ عدمے کہ بعد ازیں تن خواہد بود
مستوجب صد ہزار گفت؟ است بود

غم رونق بوستان و داغ دل ماست[4]
ہم آتش و ہم پنبہ داغ دل ماست

ہر خانہ چراغ و آفتابے دارد
باہم دہمیں غم کہ چراغ دل ماست

اے لطف تو دادہ طبع شادی غم را[5]
ذوقی دگر است از تو دل خرم را

عالم ہمہ محتاج مرار وز و شب است
در کار تراز روز و شبے عالم را

نزد تو بخواہشی زباں افگندم[6]
خود را ز زبان ایں و آں افگندم

در خواہش من ترا ز مانے نرسید
بل خواہش خویش را ز باں افگندم

---

[1] ہفت اقلیم [2] صحف ابراہیم و ہفت اقلیم [3] صحف ابراہیم [4] ہفت اقلیم [5] ایضاً [6] ایضاً

نواے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نواے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہیں وہ دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے۔ قیمت: للعہ غیر مجلد ہے

"منیجر"

مجمع البحار پر تحقیقی نظر

از جناب سید محمد مطیع اللہ صاحب راشد برہان پوری

مجمع بحار الانوار کے نام کی تحقیق کوئی نیا انکشاف نہیں ہے، ہر زمانہ کے اہل علم اس سے واقف رہے ہیں، اکابر علماء اور پرانی کتابوں کا کیا ذکر اس زمانہ کی اردو کتابوں تک میں پورا نام ملتا ہے، جن لوگوں نے مجمع بحار الانوار کے بجائے مجمع البحار لکھا ہے وہ ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ اختصار اور عرف کی بنا پر جس کی بکثرت مثالیں کتابوں کے ناموں میں ملتی ہیں، اسی طریقہ سے علامہ محمد بن طاہر کے نام کی تحقیق بھی نئی نہیں ہے، تاہم اس سلسلے میں مضمون نگار نے کافی معلومات جمع کر دئیے ہیں اور ایک قدیم تفسیر مجمع البحار کا تعارف کرایا ہے، اسلئے یہ مضمون شائع کیا جاتا ہے۔ "م"

اس کتاب کے متعلق مختلف تذکروں میں ایسے بیانات ملتے ہیں، جن کے مطالعہ سے گوناگوں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، مثلاً شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ علامہ محمد طاہر پٹنیؒ کے ذکر میں تحریر فرماتے ہیں:

۱- ودر علم حدیث توالیف مفیدہ جمع کرد از انجملہ کتابے است کہ متکفل شرح صحاح است مسمّیٰ بہ مجمع البحار و رسالہ دیگر الخ (اخبار الاخیار صفحہ ۲۸۰ ۹۹۹ھ)

خلاصہ: مجمع البحار صحاح ستہ کی شرح ہے، اور اس کے مصنف ہیں محمد طاہر رحمۃ اللہ علیہ،

۲- مولانا غوثی حسن گلزار ابرار میں حضرت شیخ طاہر سندھی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

بہت سی تصانیف صفحۂ روزگار پر یادگار چھوڑ کر ملک تقدس کو روانہ ہوئے، منجملہ تصانیف مذکورہ کے ایک تفسیر مجمع البحار ہے، جو بالکل لطائف قشیری کے اسلوب پر طائفۂ صوفیہ قدس سرہم کے نکات اور اشارات کو حاوی ہے۔ (صفحہ ۲۰۴)

ایک روز اس تفسیر کے اجزا دریائے کشف و شہود کے مستغرق شیخ لشکر محمد عارف شطاری قدس سرہٗ

کی نظر سے گذرے تو بہت خوش ہوئے، فرمایا اس رنگین کتاب کا مصنف اپنی حسنات کی جزا کا اندازہ شاید قیامت کے روز ہی کر سکے گا، کیونکہ یہ اندازہ آج کے روز ان حسنات کی کیفیت بیان کرنے سے نہیں ہو سکتا۔ (ص ۳۴۲ اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار)

خلاصہ: مجمع البحار قرآن مجید کی تفسیر ہے، اس کو حضرت شیخ لشکر عارف باللہ نے مطالعہ فرما کر بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا، اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر سندھیؒ ہیں،

۳- یہی مولانا غوثی اسی کتاب میں حضرت شیخ محمد بن طاہر نہر والہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

حدیث میں شیخ علی متقی کے شاگرد ہیں، اس فن میں ایک بے نظیر کمال حاصل کیا تھا، مجمع البحار نام ایک مشکل کشا شرح احادیث کی صحاح ستہ پر جو ہے، وہ آپ کے قلم تالیف کی لکھی ہوئی ہے۔ (اذکار ابرار ص ۳۴۲)

خلاصہ: مجمع البحار احادیث صحاح ستہ کی مشکل کشا شرح ہے، اور اس کے مصنف شیخ محمد ہیں جو شیخ طاہر نہر والہ کے فرزند تھے،

۴- مورخ سندھ علی شیر قانع تتوی تحفۃ الکرام میں مجد الدین مولانا طاہر قدس سرہ کے ذکر میں رقمطراز ہیں:

ودر علم حدیث توالیف مفید جمع کرد از انجملہ کتابے است کہ متکفل شرح صحاح ستہ مسمّیٰ بہ مجمع البحار و رسالہ دیگر الخ (تحفۃ الکرام ص ج اول)

خلاصہ: یہ عبارت اخبار الاخیار کی لفظ بلفظ نقل ہے، البتہ عنوان میں مجمع البحار کے مصنف کا نام مجد الدین مولانا طاہر لکھا ہے،

۵- علامہ غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں شیخ محمد بن طاہر الفتنی قدس سرہ کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں:

توالیف مفیدہ دارد مثل مجمع البحار در غریب الحدیث الخ (مآثر الکرام ص ۱۹۴)

خلاصہ: مجمع البحار کا نفس مضمون غریب الحدیث ہے، اور اسکے مصنف شیخ محمد بن طاہر الفتنی (پٹنی) ہیں،

۶- مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیا میں تحریر فرماتے ہیں (تذکرہ شیخ محمد طاہر گجراتی قدس سرہٗ)

و در علم حدیث تو الیف مفید جمع کرد از انجملہ کتابے است کہ متکفل صحاح است مسمی بہ

مجمع البحار و رسالہ دیگر الخ (خزینۃ الاصفیا، جلد اول ص ۴۳۶)

خلاصہ: یہ بھی اخبار الاخیار کی نقل ہے، مفہوم یہی ہے کہ مجمع البحار صحاح ستہ حدیث شریف کی شرح ہے، اور مصنف شیخ محمد طاہر گجراتی ہیں،

۷- تاریخ الاولیا، اردو میں دو جگہ تھوڑے تغیر کے ساتھ شیخ محمد طاہر گجراتی قدس سرہ اور علامہ محمد طاہر پٹنیؒ محدث رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں یہ عبارتیں ملتی ہیں،

محدث بے بدل، مفسر بے عدیل، فقیہ لاثانی تھے، اور مکہ میں شیخ علی متقی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا، اور پھر اپنے وطن کی جانب آکر تمام بدعات ملک گجرات سے دور کیا، تصانیف آپ کی متکفل شرح صحابہ مسمی مجمع البحار الخ (تاریخ الاولیا، ص ۴۴۲ ج ۲)

۸- شیخ محمد طاہر پٹنیؒ محدث رحمۃ اللہ علیہ کے حالات ہیں:

شیخ برخوردار سندی و شیخ اجل علی ابن حسام الدین متقی سے فیض کثیرہ حاصل کیا، بڑے متقی پرہیزگار صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، چنانچہ مجمع البحار، تذکرہ موضوعات وغیرہ۔ (تاریخ الاولیا ص ۲۰، ج ۲)

خلاصہ: پہلی عبارت شرح صحابہ سہو کاتب معلوم ہوتا ہے، شرح صحاح ہونا چاہیے، دوسری عبارت میں مصنف تو ملا محمد طاہر پٹنی محدثؒ کو بتایا گیا ہے لیکن تصنیف کے موضوع کا ذکر نہیں کیا گیا،

۹- حضرت مولوی خلیل الرحمٰن برہان پوری نے تاریخ برہانپور میں حضرت شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفائے کے سلسلہ میں منجملہ دیگر ناموں کے شیخ محمد طاہر پٹنیؒ مصنف کتاب مجمع البحار (صفحہ ۱۵۵) کا ذکر کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجمع البحار کے مصنف حضرت شیخ محمد طاہر پٹنی ہیں، مجمع البحار کس موضوع پر ہے؟ یہ نہیں لکھا، اسی کتاب میں حضرت مولانا شیخ قاسم (سندھی) رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں تاریخ الاولیا کے حوالے سے لکھا ہے کہ

وہ (شیخ قاسم) فرزند مولانا سندھی برہانپوری کے اور بھائی شیخ محمد طاہر پٹنیؒ صاحب مجمع البحار کے تھے، حضرت شاہ عیسی جند اللہ خلف الصدق حضرت شیخ محمد قاسم کے ہیں (تاریخ برہانپور ص ۱۶۲ طبع ثانی مطبوعہ کوثر پریس، برہان پور)

اس عبارت میں یا کاتب کی فرد گذاشت ہے یا مصنف کا سہو نظر، مسیح الاولیاء کے چچا شیخ طاہر سندھی تھے، یہاں پٹنی کے بجائے سندھی ہونا چاہیے۔

مذکورۂ بالا اقتباسات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

مجمع البحار نام کی دو کتابیں ہیں، ایک قرآن مجید کی تفسیر، دوسری شرح صحاح ستہ۔ اول الذکر تفسیر مجمع البحار کے مصنف شیخ طاہر سندھی ہیں، اور دوسری مجمع البحار شرح صحاح کے مصنف شیخ محمد طاہر پٹنی یا شیخ محمد طاہر گجراتی یا ملا محمد طاہر پٹنیؒ اور بقول بعض شیخ محمد بن طاہر نہروالہ یا شیخ محمد بن طاہر الفتنی ہیں،

اب ہر ایک مجمع البحار کے متعلق مذکورۂ بالا تذکروں سے مزید صراحت پیش کیجاتی ہے،

تفسیر مجمع البحار کا ذکر صرف مولانا غوثی حسن نے ہی اپنی کتاب گلزار ابرار میں کیا ہے، ان کے سوا دوسرے تذکرہ نگاروں میں کسی نے بھی نہ تفسیر مجمع البحار کا ذکر کیا ہے، اور نہ اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر محدث سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا۔

مولانا غوثی نے تفسیر کو دیکھا ہے، اس کا مختصر نمونہ بھی گلزار میں نقل کیا ہے، مصنفؒ کی خدمت میں انھیں نیاز بھی حاصل تھا، اور وہ آپ کی فیض رساں مجلسوں میں باریابی کا شرف بھی اکثر و بیشتر حاصل کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے تفسیر مجمع البحار کے متعلق خاص بات یہ لکھی ہے کہ اگر اس کی علمی اہمیت کے پیش نظر عادلشاہ فاروقی (راجہ علی خاں) نے بڑی منت اور معقول سفارشوں کے ذریعہ خواہش کی تھی کہ اس وقیع تصنیف کے کسی گوشہ میں میرا نام درج ہو جائے تو میرے لیے باعث عظمت دارین ہوگا، آپ نے یہ التماس قبول کی اور ایک مزید خطبہ کا اضافہ فرما دیا، کیونکہ یہ تصنیف برار میں شروع ہو چکی تھی، اور حضرت

محدث اپنے میزبان طفال خاں کے نام ایک خطبہ ابتداے کتاب میں لکھ چکے تھے، اس لیے یہ دوسرا خطبہ شاہ فاروقی کی استدعا پر منسلک فرمایا، علامہ غوثی نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں لکھا ہے:

فرمانروائے صوبہ (خاندیس) علی عادل شاہ فاروقی نے مولانا حسین شیرازی کو جو حکمت کے فنون اور عقلی علوم میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اور ندیم خاص جلال خاں براری کو جن کو رسمی علوم میں دستگاہ تھی، مصنف (شیخ طاہر سندھی) کی خدمت میں بھیجا تھا، اور التماس کی تھی کہ اگر اس پاسبان خلائق کا عہد اس کتاب میں درج کر دیا جائے تو غایت درجہ عنایت ہوگی، آپ نے یہ التماس قبول فرمائی، اس وجہ سے کتاب ہذا کا خطبہ دو طرح پر واقع ہوا ہے۔ (اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۳۴۲)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر کا نمونہ یہاں نقل کر دیا جائے، اگرچہ علامہ غوثی نے کتاب میں تطویل سے بچنے اور اختصار ملحوظ رکھنے کا جگہ جگہ اظہار کیا ہے، پھر بھی صرف ایک آیت کی تفسیر قریباً ۵ صفحات کے نصف کالم میں لکھی ہے:

فی تفسیر قوله تعالیٰ۔ فی قلوبهم مرض الخ۔ المرض حقیقة فی مایعرض للبدن فیخرجه عن الاعتدال الخاص۔ ویوجب الخلل فی افعاله ومجاز فی الاعراض النفسانیة التی یخل بکمالها کالجهل وسوء العقیدة والزینة وحب المعاصی لانها مانعة عن نیل الفضائل المودیة الی زوال الحیٰوة الحقیقة الابدیة والآیة تحتملها فان قلوبهم کانت متالمة تحزنا علی ما فات عنهم من الریاسة وحسداً علی ما یرون من اثبات امر الرسول واستعلاء شانه یوماً فیوماً فزاد الله عنهم بما زاد فی اعلاء امره واسادة ذکره ونفوسهم کانت مائفة بالکفر وسوء اعتقاد ومعاداة النبی صلی الله علیه وسلم ونحوها۔ فزاد الله ذلك بالطبع او بازدیاد التکالیف وتکریر الوحی وتضاعیف النصر

وفی الرحمانی ۔ فی قلوبهم مرض ۔ هو تفریطهم فی القوة الحکمیة وافراطهم فی الشهویة۔

فی الاحیاء اعلم ان جندی الغضب والشهوة قد ینقادان للقلب انقیاداً تاماً فیعینانه علی طریقة الذی یسلکه وقد یستعصیان علیه استعصاء بغی وتمرد حتی یملکاه ویستعبداه وفیه هلاکه وانقطاعه عن سفره الذی به وصوله الی سعادة الابد وللقلب جند آخر وهو العلم والحکمة والتفکر وحقه ان یستعین بهذا الجند فانه حزب الله تعالیٰ علی الجندین الآخرین فانهما قد یلحقان بحزب الشیطان فان من ترك الاستعانة وتسلط علی نفسه جندی الغضب والشهوة هلك ۔ هلاکاً یقیناً وخسر خسراناً مبیناً وذالك حال اکثر الخلق فان عقولهم صارت مسخرة لشهواتهم فی استنباط الحیل لقضاء الشهوة وکان ینبغی ان یکون الشهوة مسخرة لعقولهم۔

اس بلند پایہ اور اہم تفسیر کی جانب سے تذکرہ نگاروں کی بے اعتنائی یا عدم دسترس پر حیرت ہے، اگر علامہ غوثی نے اس معرکۃ الآرا تصنیف اور اس کے مصنف سے دلچسپی نہ لی ہوتی تو آج تفسیر کا نمونہ تو کیا نام بھی کسی کو نہ معلوم ہوتا، اور سندھ کے ایک فاضل اجل کا یہ کارنامہ نسیاً منسیاً ہو کر رہ جاتا،

حضرت مسیح الاولیا، نے جو شیخ طاہر محدثؒ کے بھتیجے ہیں، اپنی عربی تفسیر انوار الاسرار میں جگہ جگہ تفسیر مجمع البحار کا حوالہ دیا ہے، اس سے بھی ثابت ہے کہ مجمع البحار قرآن مجید کی تفسیر ہے، اور اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر سندھیؒ ہیں، اس تفسیر کی تاریخ تصنیف کا حکم نہ ہو سکا لیکن یہ یقینی ہے کہ دسویں ہجری کے آخری عشرہ میں بمقام برہانپور تکمیل کو پہنچی،

مذکورۂ بالا مباحث سے یہ ثابت ہوگیا کہ مجمع البحار قرآن مجید کی تفسیر ہے، اور اس کے مصنف حضرت یشخ طاہر سندھی ہیں۔

اب مجمع البحار شرح صحاح ستہ[1] اور اسکے مصنف کی جانب توجہ مبذول فرمایئے، مصنف کے نام میں تذکرہ نگاروں کا اختلاف قابل غور ہے، مذکورہ تذکروں میں اخبار الاخیار ۹۹۹ھ سب سے مقدم کتاب ہے، اس کے مصنف حضرت مولانا شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ مصنف مجمع البحار کے ہمعصر ہیں، انھوں نے کتاب کا مجمع البحار اور مصنف کا نام شیخ محمد طاہر لکھا ہے، اخبار الاخیار اس قدر مقبول رہی ہو کہ عہد طباعت سے قبل اس کی بیشمار نقلیں تیار ہونے کی شہادتیں ملتی ہیں، اور طباعت عام ہوتے ہی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، زیر نظر نسخہ مطبع مجتبائی دہلی کا مطبوعہ ہے، جو ۱۳۳۲ھ میں طبع ہوا ہے، ترقیمہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب مختلف مطابع میں کئی بار چھاپی گئی تھی، ان میں بکثرت اغلاط ہیں، مطبع مجتبائی کے علم دوست کارپردازوں نے کئی نسخے مطبوعہ قدیم و جدید بہم پہنچا کر ان کی مدد سے دو سال کی محنت میں تصحیح کرکے اس نسخہ کو طبع کیا، اصل عبارت یہ ہے:

الحمد للہ والمنۃ کہ دریں ایام سعادت فرجام کتاب اخبار الاخیار مصنفہ عالم و فاضل یگانہ مولانا عبد الحق محدث قدس سرہ کہ در تحقیق روایات و تدقیق معانی و مبانی بے نظیر و عدیم المثال ست و بارہا در مطابع مختلفہ مطبوع شدہ ہدیۂ ناظرین اولی الابصار گردیدہ اما از ممر کثرت اغلاط ہیچگاہ طبع شائقین نمی آسود در ینولا بفرمایش بعض احباب حسب الحکم جناب والد ماجد مد ظلہم العالی مصححین ماہرین علم و فن چندیں نسخ مطبوعۂ قدیم و جدید جمع فرمودہ بر تصحیح اغلاطش پرداختند و در صرف وقت و محنت دو سال از یں عہدہ برآمدند بحمد اللہ کہ اکنوں بر تصحیح تام در مطبع مجتبائی زیور حسن اتمام در برکشید الخ (ص ۳۹۲)

---

[1] معارف: مجمع بحار الانوار صحاح کی شرح نہیں ہے، بلکہ اس کے لغات کی شرح ہے۔

میں نے یہ عبارت اس لیے نقل کردی ہے کہ اس سے مطبوعہ نسخوں کے غلط ہونے کی شہادت ملتی ہے، اور اس مصحح نسخہ میں بھی بعض غلطیاں ہیں،

یہ شبہہ میں نے اس لیے ظاہر کیا ہے کہ علامہ غوثیؒ بھی مصنف مجمع البحار شارح صحاح کے ہمعصر ہیں، ان کی کتاب گلزار ابرار میں اسماء الرجال کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے منسلک ہے، ط کے باب میں صرف یشخ طاہر سندھی کا نام درج ہے، یشخ طاہر پٹنی کا نام نہیں ہے، بلکہ م کے باب میں یشخ محمد بن طاہر موجود ہے، اس صورت میں سہو کتابت کا گمان نہیں کیا جاسکتا، اور قرین قیاس یہی ہے کہ مصنف کا نام محمد بن طاہر ہوگا، ایک اور دلیل:

علامہ آزاد بلگرامی نے بھی مصنف کا نام محمد بن طاہر لکھا ہے، ان کی عبارت اخبار الاخیار ہی کا اقتباس معلوم ہوتی ہے، یا پھر ان کی نگاہ سے گلزار ابرار کا فارسی نسخہ گذرا ہوگا، علامہ آزاد کا ماخذ کوئی بھی نسخہ رہا ہو، یہ دوسری شہادت ہے کہ مصنف کا نام محمد بن طاہر ہے،

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ہر تذکرہ میں محمد طاہر یا یشخ محمد طاہر درج ہے، طاہر تنہا یا یشخ طاہر کسی نے نہیں لکھا، کسی بھی نام کے ساتھ برکت یا محض زینت کے لیے لفظ محمد کا اضافہ ہمارے زمانہ میں شروع ہوا ہے، دسویں صدی ہجری تک اس قسم کی کوئی مثال میری نگاہ سے نہیں گذری، اس لیے قیاس یہی چاہتا ہے کہ مصنف کا نام محمد بن طاہر ہونا چاہیے،

آخر میں زیر بحث کتاب مجمع البحار شرح صحاح کے نام پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، جس کا نام تمام تذکرہ نگاروں نے مجمع البحار لکھا ہے، لیکن اس کتاب کا نام مجمع البحار نہیں، بلکہ مجمع بحار الانوار ہے، یہ کتاب چھپ تو گئی ہے، لیکن جہانتک مجھے علم ہوسکا، ایک ہی بار چھپی، دوسرے ایڈیشن کی نوبت نہیں آئی،[1] پیش نظر نسخہ منشی نولکشور کے مطبع کا چھپا ہوا ہے، اس کی لوح (ٹائیٹل) کی عبارت یہ ہے:

[1] معارف: منشی نولکشور کے مطبع سے اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، حال میں اس کا نیا ایڈیشن بھی چھپا ہے (ض)

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ

ھذا الکتاب مبارک جامع لکشف مطالب الآیات وایضاح معانی

کتاب اللہ واحادیث رسولہ المختار

مجمع بحار الانوار

فی غرائب التنزیل ولطائف الاخبار۔ تالیف الفاضل الورع الماہر

شمس المفاخر مولانا الشیخ محمد طاہر افاض اللہ علینا من برکاتہ

طبع فی المطبع العالی منشی نولکشور ذی المعالی

کتاب عربی زبان میں ہے، اور پاکیزہ خط نسخ میں تحریر ہے، ٹائیٹل کی عبارت بھی نسخ میں ہے اور کتاب کا نام دیدہ زیب طغرا میں تحریر ہے، جو صاف اور بلا اشتباہ مجمع بحار الانوار پڑھا جاتا ہے، خاتمہ یا ترقیمہ میں بھی اسی نام کا اعادہ کیا گیا ہے، جس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

تم بحمد اللہ وحسن توفیقہ الثلث الاول من مجمع البحار الانوار فی غرائب التنزیل ولطائف الاخبار۔ فی العشرین من شہر المبارک رمضان ضاعف اللہ قدرہ وضاعف اجر من عظمہ فی البلد المسمی بالفتن صانہا اللہ عن الفتن۔

ان فقروں سے ظاہر ہے کہ کتاب کا نام مجمع بحار الانوار ہے، رہا یہ کہ تمام تذکرہ نگاروں نے مجمع البحار کیوں لکھا ہے اس کی مختلف تاویلیں کیجا سکتی ہیں، سب سے پہلا تذکرہ جس میں اس کتاب اور مصنف کا ذکر ملتا ہے، اخبار الاخیار ہے، اس کا قلمی نسخہ میری نگاہ سے نہیں گذرا، یہ کتاب عرصۂ دراز سے چھپ رہی ہے، اور کئی اشاعتیں چھپ چکی ہیں، جن میں مرور ایام اور متواتر کاتبوں کی لاپروائی سے بڑی غلطیاں ہیں، ممکن ہے زیر بحث کتاب کے نام میں بھی اسی سلسلہ میں سہو ہو گیا جو بعد میں متداول ہو

یا پہلی اشاعت جس قلمی نسخہ سے کی گئی ہے، اس میں سہو کتابت سے مجمع بحار الانوار کے بجائے مجمع البحار درج ہو گیا ہو، اور بعد میں یہی غلط نام رائج ہو گیا ہو،

گلزار ابرار کے ترجمہ اذکار ابرار میں بھی شرح صحاح ستہ کا نام مجمع البحار ہی لکھا ہے، مگر گلزار ابرار کا فارسی قلمی نسخہ کمیاب بلکہ نایاب ہے، اس کا اردو ترجمہ ہی متعارف و متداول ہے، یہی اشتباہ یہاں بھی ہوتا ہے، کہ مترجم یا کاتب نے سہواً نام میں تبدیلی کر دی ہوگی،

اندازہ ہوتا ہے کہ شرح صحاح کا ذکر کرنے والوں میں سے کسی نے بھی اصل کتاب کو نہیں دیکھا ہے، اس کی غائبانی شہرت کی بنا پر اس کا مختصراً ذکر درج کتاب کر دیا، کیونکہ اخبار الاخیار اور گلزار ابرار میں اس کی کسی عبارت کی نقل یا اقتباس درج نہیں ہے اور نہ کسی نے اس کو بچشم خود دیکھنے کے متعلق اشارہ کیا ہے،

میں ان تحریروں کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دونوں کتابیں ہمنام نہیں، بلکہ دونوں کے جدا جدا دو نام ہیں۔ (۱) مجمع البحار تفسیر۔ (۲) مجمع بحار الانوار شرح صحاح ستہ۔

مجمع البحار قرآن مجید کی عربی زبان میں صوفیانہ و عارفانہ تفسیر ہے، اور اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر محدث سندھی ہیں۔

مجمع بحار الانوار۔ عربی زبان میں صحاح ستہ کی شرح ہے، اور اس کے مصنف حضرت شیخ محمد طاہر یا محمد بن طاہر پٹنی ہیں، بلکہ محمد بن طاہر ہی زیادہ قرین قیاس ہے،

مسلمانان ہند کا نظام تعلیم

از

جناب مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء

مولانا محمد اسحاق صاحب نے مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ پر غور و فکر بھی کیا ہے اور دینی تعلیم کا انھیں عملی تجربہ بھی ہے، اس مضمون میں انھوں نے ان کی دینی و دنیوی ضروریات کے پیش نظر ان دونوں تعلیموں کے نظام کے متعلق اپنے خیالات پیش کیے ہیں، مسئلہ کی اہمیت کے لحاظ سے اگر کوئی اور صاحب علم اس موضوع پر لکھنا چاہیں تو اسکو مسرت کے ساتھ شائع کیا جائیگا۔ (م)

قوموں کے عروج و زوال بلکہ ان کی زندگی و موت میں ان کے نظام تعلیم کو جس قدر دخل ہے وہ بیان و استدلال سے مستغنی ہے، غیر ضروری طوالت سے بچنے کے لیے میں بغیر کسی تمہید کے اس مسئلہ کو پیش کرتا ہوں کہ موجودہ دور اور حالات حاضرہ میں ہمیں مسلمانان ہند کے تعلیمی مسئلہ پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔

مروجہ نظام تعلیم کی ہلاکت خیزی

ہمیں اس حقیقت کو سامنے رکھنا ضروری ہے کہ ہم ۱۹۵۵ء میں سوچ رہے ہیں اور ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے ہمارے ماضی و حال میں شرق و مغرب کا فرق پیدا کر دیا ہے، تحریروں میں ہماری حیثیت جو کچھ ہو لیکن تعامل کے متلاطم دریا میں یہ کاغذی کشتی کب کی غرق ہو چکی ہے، اور اس واقعہ کا انکار خود فریبی یا فریب کاری ہے کہ ہمارا حال ماضی سے بدرجہا بدتر اور تکلیف دہ ہے۔

میں دور نہیں جانا چاہتا، مجھے یاد ہے کہ یہاں مجھے صرف تعلیمی مسئلہ پر گفتگو کرنی ہے، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ان بدلے ہوئے حالات نے نظام تعلیم میں بھی ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے، اور ہندوستان کا موجودہ

نظام تعلیم ہمارے قومی مزاج کے اسقدر مخالف ہے کہ اگر ہم نے اپنی حفاظت کے لیے انتہائی شدید جد و جہد نہ کی اور اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص ہمارے شامل حال نہ ہوئی تو ہمارے نونہال اور نوجوان سب کچھ باقی رہ سکیں گے مگر مسلمان نہیں رہ سکیں گے۔

برطانوی دور میں نظام تعلیم کی پشت پناہی حکومت کی مشینری کے لیے پرزے ڈھالنے کا جذبہ کر رہا تھا، ہم نے سخت غلطی کی کہ اس جذبہ کی تسکین کے لیے تیار ہو گئے، اگرچہ اس سے ہم کو انفرادی فوائد حاصل ہوئے، لیکن اجتماعی و دینی حیثیت سے سخت نقصان اٹھایا، مگر موجودہ نظام تعلیم اس سے بھی زیادہ مسلمانوں کے لیے مہلک ہے، اس کے ذریعہ وہ اکثریت میں جذب ہو جائیں گے، اگر ہم نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو اس کے معنی اجتماعی اور قومی خودکشی کے ہوں گے، برطانوی دور میں ہم نے ایک غلطی کی، مگر اس کی تلافی کا امکان تھا، لیکن یہ غلطی وہ خطاء عظیم ہوگی جس کی تلافی قیامت تک نہ ہو سکے گی۔

ماضی کے ذہن سے حال میں سوچنا کس قدر مضحکہ خیز ہے؟ اگر آج بھی آپ اپنی اولاد کو کلرک یا آفیسر بنانے کے لیے تعلیم دینا مقصود ہے تو دفتروں اور ملازمتوں کے دروازے بند ہو چکے ہیں، اگر دینی تعلیم کا اصل حنفی شافعی اختلافات پر عبور ہے تو اب ان مباحث کی افادیت بہت کم ہو چکی ہے، اور اسی دائرے میں محدود رہ کر ہم دین کی کوئی معتد بہ خدمت نہیں انجام دے سکتے۔

نظام تعلیم کا اجتماعی تصور

سارے عالم میں مسلمانوں کی تعداد کروروں سے گنی جا سکتی ہے، باوجود اس کے ان کی پستی، ان کی مقہوریت و مظلومیت کس چیز کا نتیجہ ہے، اجتماعیت کا فقدان اور انفرادیت کا غلبہ وہ مہلک مرض ہے جس نے پوری قوم کی قوتوں کو مضمحل کر دیا ہے، ہم میں انفرادی تقویٰ تو کسی حد تک ہے مگر اجتماعی تقویٰ سرے سے مفقود ہے، یہی ہلاکت آفریں مرض ہماری علمی زندگی میں بھی کارفرما ہے، ہم میں ہر شخص اپنی، اپنی اولاد، یا اپنے عزیزوں کی تعلیم کے متعلق محض انفرادی حیثیت سے سوچتا ہے، گویا وہ قوم سے بے تعلق ہے، اور اس سے الگ ہو کر بھی اپنے وجود کو باقی رکھ سکتا ہے، بحالات موجودہ اس

اسلئے غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ہمیں اب نظام تعلیم کے مسئلہ پر اجتماعی نقطۂ نظر سے غور کرنا ضروری ہے دین و دنیا کے غلط تفرقہ کو ختم کیجیے، تعلیم دینی ہو یا دنیاوی اس کا نظام صرف ایک ہی نصب العین کے ماتحت ہوگا، ہمیں صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ نظام ہمارے دینی و قومی مزاج سے کس قدر مناسبت رکھتا ہے اور اس کی صحت و قوت میں کس قدر معاون ہے، یاد رکھیے کہ اجتماعی و قومی مزاج کا فساد ہلاکت و فنا کے مراوف ہے، جو قومیں اپنے مخصوص مزاج کو باقی نہیں رکھ سکتیں، کچھ عرصہ کے بعد وہ اپنے مستقل وجود سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں، اور دوسری قوموں میں جذب ہو کر فنا ہو جاتی ہیں، ہمارے اجتماعی مزاج میں عرصہ دراز سے فساد پیدا ہو گیا ہے، اب ماحول ایسا ہے جو اس فساد کو بہت سرعت کے ساتھ ترقی دے گا، اگر ہم نے اب بھی غفلت سے کام لیا تو وہ دن دور نہیں کہ ہم اکثریت میں جذب ہو کر فنا ہو جائیں، ایک صحیح اور صحت بخش نظام تعلیم کے ذریعہ سے ہمیں اس فساد کو دور کرنا ہے، ہمیں وہ سب کچھ حاصل کرنا ہے، جو ہم کھو چکے ہیں اور وہ بھی حاصل کرنا ہے جو بحیثیت مسلمان حاصل کرنا چاہیے۔

اقسام تعلیم ایک مسلمان کے لیے تعلیم کو دینی دنیاوی دو حصوں میں تقسیم کرنا بہت دشوار ہے، مسلمان صرف ایک ہی چیز کو جانتا ہے، اور وہ دین و آخرت ہے، ملعون ہے وہ شے جس سے آخرت کا کوئی فائدہ حاصل ہو سکے ملعون تر ہے وہ چیز جو آخرت کے لیے مضر ہو، ہمارے نظام تعلیم کا محور دین ہی ہو سکتا ہے، خواہ وہ کتاب الٰہی اور احادیث نبویہ کی تعلیم ہو یا طبعیات و ریاضیات کی، فقہ کی ہو یا تعزیرات ہند کی، عربی کی ہو یا انگریزی کی، ہر جائز علم کو آخرت کے لیے بنا لینا اور اسلامی مقاصد و اصول کے ماتحت حاصل کرنا ہماری خصوصیت امتیازی اور ہمارا قومی مزاج ہے، اسے ضائع کر کے ہم باقی نہیں رہ سکتے،

نفس دین کی تعلیم اور دین کے لیے دنیا کی تعلیم، صحیح کہی جا سکتی ہے، قرآن، حدیث، فقہ کی تعلیم کو ہم دینی تعلیم کہتے ہیں، اور طبعیات، ریاضیات، انگریزی وغیرہ علوم و فنون کی تعلیم کو ہم دنیاوی تعلیم سے موسوم کرتے ہیں۔

دینی تعلیم سیاسی و معاشی زوال اور تاریک ماحول کے باوجود کئی صدیاں گذرنے پر بھی آج ہمیں اپنے اسلام پر فخر ہے، یہ کس چیز کا اثر ہے؟ اس روشن حقیقت کا انکار کرنا ممکن ہے کہ اس پردۂ ظلمات میں ہماری زندگی کے ضامن آبحیات کے وہ چشمے رہے ہیں، جنھیں دنیا عربی مدارس کے نام سے جانتی ہے، شکستہ بوریوں پر بیٹھکر پڑھانے اور پڑھنے والے وہ جانشینان نبی فداہ ابی و امی جنھیں بے خبر ملاؤں کے نام سے یاد کرتے ہیں، قوم کی شمع حیات کو آج تک جلاتے رہے، اور بلاشبہہ ہماری دینی، قومی، اجتماعی زندگی ان ہی کی مسیحا نفسی کی مرہون منت ہے،

اللہ تعالیٰ کی اس نعمت عظمیٰ کا ذکر ضروری ہے کہ ہماری دینی تعلیم کا رخ اور رجحان بالکل صحیح اور ہماری دینی و قومی مزاج کے مناسب رہا ہے اور آج تک ہے، دار العلوم دیوبند، سہارنپور، دار العلوم ندوۃ العلماء، مدرسہ فرقانیہ اور اسی قسم کے دوسرے دینی اداروں کا نصب العین شروع سے آج تک یہی رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خادم پیدا کیے جائیں، اور دل و دماغ کو دین کی روشنی سے زیادہ سے زیادہ منور کیا جائے،

لیکن نصب العین ایک رہنے کے باوجود حالات و ضروریات کی بنا پر تدابیر میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے، موجودہ دور میں حالات بدل جانے کی وجہ سے ان مدارس کے نظام میں کچھ اہم تبدیلیاں اشد ضروری ہیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارے ان دینی حلقوں پر بھی دشمنان دین کا قبضہ نہ ہو جائے، اور ہماری یہ دینی فوج نئے سامان جنگ سے محروم ہونے کی وجہ سے عاجز ہو کر ہتھیار ڈالنے اور بے سود مدافعت پر مجبور ہو جائے، راقم السطور کی نظر میں ہمارے ان عصبی مرکزوں میں مندرجہ ذیل تغیرات بہت ضروری ہیں،

(۱) تحریک موجودہ عصر کی روح ہے، جو باطل نظریہ پھیلنا چاہتا ہو وہ تحریک کی شکل اختیار کر لیتا ہے، ہمارے دینی مدارس کے نصاب میں ایسی تبدیلیوں کی ضرورت ہے جس سے طالب علم

(الف) موجودہ باطل تحریکات و نظریات کے بارہ میں ناقدانہ بصیرت حاصل کرکے انکا مقابلہ کرسکے۔

(ب) اس کو ان تدابیر سے واقفیت ہو جو اہل باطل حق کی مخالفت میں استعمال کرتے ہیں، اور ان کا جواب دے سکے،

(ج) وقت کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے، علوم غیر مقصودہ کی تعلیم میں ہمیں ضروری اور غیر ضروری کے درمیان خط فاصل کھینچنا پڑے گا، اس طرح ہم وقت کی بچت اور جدید ضروری علوم کے لیے گنجائش کے دوگونہ مقاصد حاصل کرسکتے ہیں،

(د) قرآن مجید اور سیرت نبوی دونوں ہمارے دائمی رہنما ہیں، طالبان علوم دینیہ کا ان دونوں سے زیادہ سے زیادہ تعلق پیدا کرایا جائے، اور موجودہ اسلامی مسائل کا حل ان کی روشنی میں تلاش کرنے کی عادت ڈالی جائے،

۲۔ زمانہ کے تغیرات نے خانقاہوں کا بار بھی مدارس کے سر ڈال دیا ہے، اس لیے تعلیم کے ساتھ تربیت اخلاق و اعمال پر خصوصی توجہ مدارس کا اہم ترین فریضہ ہونا چاہیے۔

۳۔ ان مدارس کے طلبہ کو مسلمانوں کا قائد بننا ہے، ایک قائد کے لیے علاوہ علم کے کچھ دوسرے صفات کی بھی احتیاج ہوتی ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مدارس کے طلبہ میں قوم کی دینی قیادت کی صلاحیت پیدا کریں، اور ان کی تعلیم و تربیت ایسے عنوان سے کریں کہ وہ عام مسلمانوں کے سامنے ایک نمونہ کی زندگی پیش کرسکیں، ان میں دعوتی روح ہو، اور وہ کتاب و سنت کی جانب دعوت مجسم بن کر نکلیں،

۴۔ مدارس عربیہ کا ایک وفاق ایسی شکل میں قائم کیا جائے جس سے ایک دوسرے کے مشوروں سے فائدہ اٹھا سکیں اور دین کے مختلف شعبوں کے لیے خدام تیار کرنے کے لیے تقسیم کار اور تعاون کرسکیں

۵۔ مدارس کا ربط عوام کے ساتھ بڑھایا جائے اور طلبہ کو عوام الناس میں دینی شعور بیدار

کرنے، دینی رجحان پیدا کرنے اور اسلامی زندگی کو رواج دینے کی مشق کرائی جائے،

۶۔ ایسی صورتیں اختیار کی جائیں کہ معاشی اعتبار سے دینی مدارس خود کفیل ہو جائیں، محض چندوں پر ان کا دارومدار نہ رہے، ملک کے عام معاشی تغیرات اور مسلمانوں کے معاشی انحطاط کے پیش نظر چندے کا ذریعہ روز بروز کمزور ہوتا جاتا ہے،

۷۔ سیلاب ارتداد سے بچانے اور دینی شعور بیدار کرنے میں بنیادی دینی تعلیم کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ دینی مدارس کو اس مہم کے سر کرنے میں پیش پیش ہونا چاہیے، مکاتب قائم کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ان کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ کی فراہمی کا کام بھی دین کی ان چھاؤنیوں کو اپنے ذمہ لینا چاہیے، فارغ طلبہ مشکوٰۃ و بیضاوی پڑھانے کی صلاحیت رکھنے کے ساتھ بچوں کو کلمہ طیبہ اور نماز کی تعلیم آسانی سے دینے کے قابل بھی ہوں۔

دنیاوی تعلیم

دینی تعلیم کے متعلق میں عرض کرچکا ہوں، اس کے نصاب تعلیم یا طریق تعلیم کے متعلق اختلاف و اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن یہ واقعہ قابل مسرت ہے کہ اس کا رخ ہمیشہ درست رہا ہے، لیکن اسی قدر افسوس کے قابل یہ حقیقت ہے کہ ہماری دنیاوی تعلیم کا رخ ابتدا ہی سے بالکل غلط تھا، خشت اول کی اس کجی نے پورے نظام تعلیم کی عمارت ٹیڑھی کردی۔

اس مسئلہ میں ایک بنیادی غلطی کی تشریح اوپر کیجا چکی ہے، یعنی تعلیم کا انفرادی تصور، اب اس سے زیادہ خطرناک اصولی غلطی کی وضاحت کی جاتی ہے،

تعلیم کے معاملہ میں معلومات کی فراہمی سے زیادہ اہمیت اس ذہنی رجحان کو ہے جو تعلیم اور درسگاہ کا ماحول پیدا کرتا ہے، اگر یہ رجحان غلط ہے تو کبھی علم مفید و نافع نہیں ہو سکتا، ہماری بدنصیبی یہ رہی ہے کہ ہمارے کالجوں اور اسکولوں میں اس حقیقت سے غفلت برتی جاتی ہے، مسلم نوجوان تعلیم کا منتہا پیٹ کو سمجھتا ہے، ملازمت کو معراج کمال سمجھکر حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے،

اس کو دین سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، یہ غلط رجحان اجتماعی و قومی حیثیت سے بہت مضر بلکہ مہلک ہے، وقت کا نازک مزاج اس بے راہروی کو اب برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، اور نہ قوم کی نازک حالت اس غفلت شعاری اور ستم کیشی کی روادار ہے،

حقیقت پسندی اور سلامت فہم کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اب اپنے اس جرم عظیم سے باز آجائیں، اور ہمارے دنیاوی تعلیم کے ادارے بھی اس حیثیت سے دینی بن جائیں کہ طلبہ اور اساتذہ یہ محسوس کریں کہ ہمارے علمی سفر کی منزل مقصود اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ہے، ہم قوم کی کشتی کے ملاح ہیں اور یہاں صرف اس لیے آئے ہیں کہ اپنے دست و بازو میں اسے ساحل مراد تک پہنچانے کی قوت پیدا کریں، پیٹ پالنا ایک ثانوی چیز ہے نہ کہ اولین مقصد، اولین مقصد دین ہے، کل علوم کتاب و سنت کے خادم ہیں، اور ہماری معراج یہ ہے کہ ہم اپنی علمی و عملی زندگی کو اعلاء کلمۃ اللہ اور خدمت دین کیلیے وقف کر دیں، اس رجحان کو ہمارے نظام تعلیم کی روح ہونا چاہیے، لیکن کیا ہمارے تعلیمی اداروں کی موجودہ جسمانی ساخت اس روح سے مناسبت رکھتی ہے، مشاہدہ نفی میں جواب دیتا ہے، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کے ڈھانچوں میں اہم اور انقلاب انگیز تبدیلیاں کریں، اور انھیں اس روح کے لیے سازگار بنائیں، بلکہ اللہ تعالیٰ توفیق دے تو اس اصول اور نصب العین کے پیش نظر نئے ادارے قائم کریں،

مندرجۂ بالا مقاصد اور حالات کے پیش نظر جس طرز کے علمی اداروں کی ہمیں ضرورت ہے ان کا ایک اجمالی خاکہ درج ذیل ہے،

سب سے پہلی اور بنیادی چیز تو یہ ہے کہ ہماری نئی نسلوں کی تعلیم ایک منصوبہ (Plan) کے ماتحت ہونی چاہیے، جو اب تک بالکل مفقود ہے، طلبہ کا جم غفیر تعلیمی اداروں کی طرف اس طرح چلتا ہے جیسے کوئی سیلاب میں بہتا ہے، نہ ان کے سامنے کوئی مقصد ہوتا ہے، نہ قومی ضروریات کا

کوئی نقشہ؛ اداروں اور سرپرستوں کے سامنے کوئی اچھی چیز ہوتی ہے، وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ پڑھنا اور پڑھانا چاہیے، کس لیے؟ اور کیوں؟ اس کی طرف انھیں کبھی توجہ نہیں ہوتی، ایک سمجھدار آدمی اپنی ماہانہ آمدنی کو بھی ایک منصوبہ کے ماتحت صرف کرتا ہے، لیکن کس قدر قابل افسوس بات ہے کہ ہم ذہانت و عمر کے اس بے بہا قومی سرمایہ کو بغیر سوچے سمجھے ہوئے بغیر کسی منصوبہ و مقصد کے صرف کر ڈالتے ہیں،

اس لیے اداروں کا اولین فرض ہے کہ وہ اندازہ لگائیں کہ ہمیں دینی و قومی حیثیت سے کس قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے؟ ہمیں تاجروں کی بھی ضرورت ہے، سائنس دانوں کی بھی حاجت ہے، سیاست دانوں کی بھی احتیاج ہے، غرض ہر شعبۂ حیات کے لیے ہمیں بہترین آدمی درکار ہیں، جو صلاحیت کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے ہوں، اور جن کا مقصد وحید دین کی ترقی، کلمۃ اللہ کی بلندی، قوم کی سربلندی اور ملت کی رفعت ہو، اس اندازے کے بعد طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں اور فطری مناسبتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ضرورت کے تناسب سے ہر شعبۂ تعلیم میں طلبہ کی مناسب تعداد کو رکھا جائے، اور ان پر پوری محنت و کوشش صرف کیجائے،

یہ ایک اصولی اور عمومی بات ہے، حالات کے لحاظ سے راقم الحروف کے خیال میں اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی صحیح خدمت انجام دینے کے لیے اقسامِ ذیل کے تعلیم یافتہ افراد کی شدید ضرورت ہے، جن کی تیاری ہمارے تعلیمی اداروں کا فرض ہے،

۱۔ قوم کی موجودہ زبوں حالی میں میرے نزدیک خود قوم سے زیادہ قصور اس کی قیادت کا ہے، مسلمانوں کی آئندہ قیادت کے لیے یہ چیز ہوا اور پانی سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ ان کی قیادت ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے جو دین و دنیا کے جامع ہوں، لیکن ایسے اشخاص نادر ہیں اور عرصہ تک نادر ہی رہیں گے، اس کمی کی تلافی اس صورت سے ہو سکتی ہے کہ ہمارے دینی مدارس

دینی قائد اور دنیاوی مدارس ایسے قائد پیدا کریں جو دینی قائدین کے مشورے سے مسلمانوں کی دنیاوی قیادت کرسکیں، یعنی انھیں ایسے راستہ پر لگا سکیں جو دنیاوی و مادی قوتوں کو دینی و ملی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ مفید و پرمنفعت بنائیں، ایسے ہی اشخاص ملت کی کشتی کو موجودہ بلاخیز طوفان سے بچا کر ساحل مراد تک صحیح سلامت پہنچا سکتے ہیں،

۲- ایسے عوام کی بھی ضرورت ہے جو صحیح قائد کا انتخاب کرسکیں، اور تعمیر ملی میں اس کا ہاتھ بٹا سکیں، جن میں دینی و ملی خدمت کا جذبہ موجود ہو، اور اتنی فہم ہو کہ اپنے قائدین کی بات کو سمجھیں،

۳- جو تعلیم صرف ملازمتوں کے لیے دی جائے گی وہ سم قاتل ہے، خصوصاً موجودہ حالات میں جبکہ ملازمتوں کے دروازے مسلمانوں کے لیے بند ہو چکے ہیں، صنعتی تعلیم کی ضرورت تو پہلے بھی تھی مگر اب اور شدید ہو گئی ہے، صنعت و حرفت کی تعلیم ہمارے ہر ادارے میں لازمی ہونی چاہیے، اس طرح ہمارا معاشی مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہو جائے گا، اور خود ان اداروں کا معاشی مسئلہ بھی لاینحل نہ رہیگا،

۴- سائنس کے مفید شعبے مثلاً طبیعیات، کیمیا، ریاضی، انجینیری، طب جدید، نباتات وغیرہ کی تعلیم اس وقت نہ صرف مسلمانان ہند کے لیے، بلکہ مسلمانان عالم کے لیے بہت ہی ضروری اور بہت ہی مفید ہے، مسلمانوں کے سیاسی و معاشی زوال کے مادی اسباب کا اگر جائزہ لیا جائے تو سائنس سے ان کی بے رخی کو غالباً سرفہرست درج کرنا ہوگا، ملٹن اور شیکسپیر پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اگر مسلمان سائنس کے مفید شعبوں میں اپنی ذہانت و ذکاوت صرف کریں تو اس سے علمی ترقی کا راستہ بہت مختصر ہو جاتا ہے، سائنس کی تعلیم کے متعلق مجھے دو باتیں خصوصیت سے کہنی ہیں، پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہر وہ علم جس پر سائنس کا لیبل لگا دیا جائے مفید ہی نہیں ہوتا، اس کے بعض شعبے ایسے بھی ہیں جن میں کوئی افادیت نہیں ہے، اور کسی قوم کے ملی و دینی عروج و زوال پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا، ان میں وقت صرف کرنا اضاعت عمر و قوت ہے، اس لیے دیکھنا یہ چاہیے کہ کس علم کی تحصیل

دینی و ملی اعتبار سے ہمارے لیے مفید اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہمیں سربلند کرنے والی ہیں، کاش ہمارے تعلیمی ادارے، ہمارے نوجوان، اور ان کے سرپرست دیرینہ غفلت سے بیدار ہوں، اور مفید و غیر مفید علوم میں امتیاز کریں، معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم سے اللہ کی پناہ مانگی ہے، جو مفید نہ ہو، یہ حقیقت بھی سامنے رکھیے کہ جو چیز آخرت میں مفید نہیں ہے (خواہ وہ بلاواسطہ ہو یا بالواسطہ) ایک مسلمان کی نگاہ میں اس کوئی قیمت نہیں ہے،

دوسری ضروری بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ سائنس کی تعلیم صرف علمی و نظری یعنی مسائل کی تفہیم تک محدود نہ ہو، بلکہ پوری کوشش اس پر صرف کیجائے کہ طلبہ میں اجتہاد و اختراع کا مادہ پیدا ہو، اور وہ صرف یورپ کی گاڑی کے قلی نہ بنیں بلکہ خود اپنی گاڑی تیار کرسکیں،

۵- طلبہ کی اخلاقی و دینی تربیت کی طرف خاص طریقہ سے توجہ کی ضرورت ہے، مسلمانوں کی پوری تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ انھیں دوسری قوموں پر جب کبھی فوقیت حاصل ہوئی ہے تو محض دینی و اخلاقی امتیاز و برتری کی وجہ سے۔ اور ان کا انحطاط و زوال بھی دین ان کے تعلق کے کمزور ہونے سے وابستہ رہا ہے، ان کے دور حکمرانی میں اقتدار کی قوت نے انکی موت کی رفتار کو قدرے سست کر دیا تھا، برطانوی عہد میں مغلوبیت سیاسی تھی عددی نہ تھی، ترک اسلام کی کوئی دعوت بھی نہ تھی، ان چیزوں نے جینے کی کچھ مہلت دیدی، لیکن اب ایک ایسی قوم کے ساتھ بسر کرنا ہے جسے ہم پر سیاسی و معاشی غلبہ حاصل ہے، تعداد کے لحاظ سے بھی اس کی اکثریت ہے، وہ اپنے کلچر کی دعوت دے رہی ہے، ان حالات میں اگر ہماری دینی حالت میں ترقی نہ ہوئی، تو وہ وقت دور نہیں جب علماء، صوفیہ، صلحاء و اتقیا کی اس سرزمین میں اسلام کا نام بھی باقی رہنا مشکل ہو جائے گا، الحاد، دہریت، بد اخلاقی، فسق، بے حیائی، شرک وغیرہ کے طوفان جس شدت و قوت کے ساتھ حملہ آور ہیں، ان کا مقابلہ صرف اسلامی ناموں سے نہیں، بلکہ اسلامی کاموں، اسلامی سیرتوں، اسلامی ولو(لوں)

اور دماغوں سے ہو سکتا ہے، ہمارے انگریزی اسکول اور کالج، ان بد اعمالیوں اور اللہ تعالیٰ سے باغی بنانے والی تحریکوں کے مخزن بنے ہوئے ہیں، کیا وہ اسلام کے نافرمانوں اور اللہ کو بھولنے والوں کو تعلیم دے کر دین یا قوم کی کوئی خدمت انجام دے رہے ہیں؟ جس ادارے سے عبد الرحمن بجائے عبد الدنیا اور عبد البطن بنکر نکلیں، کیا اسے کسی معنی میں بھی اسلامی یا مسلم ادارہ کہا جا سکتا ہے؟ قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے ہمیں ایسے آدمی درکار ہیں، جن کی روح اسلامی ہو، جذبات و میلانات اسلامی ہوں اور اس کے ساتھ وہ دنیاوی علوم و فنون سے آراستہ ہوں،

۶- ہمارے تعلیمی اداروں کا طرز عمل بہت مسرفانہ ہے، قوم کی موجودہ معاشی حالت کسی طرح اس کی متحمل نہیں ہو سکتی، مسلمانوں کے لیے ادنیٰ و اعلیٰ ہر قسم کی تعلیم ارزاں سے ارزاں ہونی چاہیے اگر اداروں کا معیار زندگی پست کر دیا جائے اور ان کی مناسب تنظیم ہو جائے تو تعلیم کی ارزانی کچھ مشکل نہیں ہے. جفاکش، محنتی اور باہمت ناخدا ہی اب قوم کی کشتی کو پار لگا سکتے ہیں، اور ایسے افراد کا تیار کرنا ان اداروں کا فریضہ ہونا چاہیے،

ایک طرف صاحب علم و فہم، متقی، نیک سیرت علمائے دین ہماری دینی رہبری و قیادت کریں، دوسری طرف دیندار، بلند کردار، جفاکش، اسلامی روح رکھنے والے نئے تعلیم یافتہ اشخاص ہماری دنیاوی رہبری کے لیے موجود و مستعد ہوں تو کون ہمیں مٹانے کی ہمت کر سکتا ہے.

اسی قسم کے اشخاص پیدا کرنے، اور انھیں دینی و قومی خدمت پر لگانے کے لیے ہمیں نصاب تعلیم اور طریق تعلیم پر بھی نظر ثانی کرنا پڑے گی، سطور ذیل میں اس مسئلہ کے متعلق بھی چند اصولی اشارات کیے جاتے ہیں.

ابتدائی تعلیم ابتدائی تعلیم سے متوسط اور متوسط سے اعلیٰ تعلیم تک پہنچنے والوں کی تعداد گھٹتی رہتی ہے، اکثریت کی تعلیمی جد و جہد ابتدائی تعلیم تک محدود رہتی ہے، یہ محدود تعلیم و تربیت

قیادت کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ناکافی ہے، لیکن اس درجہ کے طالب علم کو ایک سمجھدار اور زمانہ شناس، عامی مسلمان بنا دینا آسان ہے، ابتدائی درجات میں ہمارا نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہیے، جسے پڑھکر طالب علم اسلام کے تمام احکام و عقائد پختگی کے ساتھ معلوم کر لے، جن کا علم ہر عامی مسلمان کے لیے ضروری ہے، عربی زبان سے بھی معمولی واقفیت پیدا ہو جائے اور قرآن مجید کے ایک مختصر حصے کا ترجمہ اور کچھ احادیث سے بھی اسے واقف ہو جانا چاہیے، تاکہ اسلامی و قرآنی دعوت کو سمجھ سکے، اس کے ساتھ علوم و السنۂ عصریہ خصوصاً سائنس و ریاضی و انگریزی وغیرہ سے اسے معیاری واقفیت ہو جائے، صنعتی تعلیم بھی ان درجات میں لازم ہونا ضروری ہے، اسلامی روح، دینداری اور خدمت اسلام و مسلمین کا جذبہ پیدا کرنا نصاب سے زائد طریق تعلیم و تربیت پر منحصر ہے، اسے بھی مقصد کے مناسب ہونا چاہیے،

اس مرحلے پر یہ مقصد ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے کہ ہم ایسا مواد خام تیار کرتے رہیں جو دینی اور دنیاوی دونوں قسم کے اداروں میں کارآمد ہو سکے، تعلیم کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد طالب علم اگر چاہے تو کسی دینی درسگاہ کا راستہ لے اور ایسا عالم دین بننے کی کوشش کرے جو دنیا سے بھی ناواقف نہیں ہے، اور زمانہ کا رخ پہچاننے کی استعداد رکھتا ہے، اور اگر چاہے تو اپنا راستہ بدستور طے کرتا رہے اور علوم عصریہ کا ایسا فاضل بننے کی کوشش کرے جو دین سے بھی آشنا و واقف ہو کر علمائے دین کی رہنمائی میں اپنی اور دوسروں کی دنیا کو دین کے لیے مفید بنا سکے، اور دنیاوی تدابیر کا بہترین استعمال کر سکے.

ثانوی تعلیم ثانوی یا متوسط درجات میں ہماری کوشش اوسط درجہ کے قائد بنانے کی ہونی چاہیے، اس سے مراد سیاسی قائد ہی نہیں ہیں، بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ایسے اشخاص تیار کیے جائیں جو زندگی کے خاص خاص شعبوں میں اپنی قابلیت و صلاحیت کے لحاظ سے دنیاوی تدابیر کے بارے میں قوم کی

رہنمائی کر سکیں، مثلاً ایک صناع صنعت و حرفت کے بارے میں رہنما بن سکے، سائنٹسٹ صناعوں اور اہل حرفہ کو مزید ترقی کی تدابیر سے روشناس کر سکے، وعلیٰ ہذا۔ ان سب میں مشترک شے یہ ہونی چاہیے کہ درجہ کے قائدین دینی و قومی مفاد کے لیے جو مشورے دیں انھیں سمجھ کر اپنے حلقۂ اثر میں عملی شکل میں لانے کی کوشش کر سکے، اور قوم میں دینی جذبات و رجحانات پیدا کر سکے۔

نصب العین کی مناسبت سے نصاب تعلیم میں امور ذیل کا لحاظ کرنا چاہیے۔

(الف) دینی تعلیم لازم ہو اور اس کا معیار ابتدائی درجات سے نسبۃً بلند ہو، عربی زبان اور ترجمۂ قرآن مجید کی مقدار میں کچھ مزید اضافہ اور سیرت نبوی و سیرت صحابہ سے روشناس کیا جائے، اس کے ساتھ جس شعبۂ تعلیم کو طالب علم نے اختیار کیا ہے، اس کے متعلق احکام شرعیہ مناسب تفصیل سے بتا دیے جائیں، مثلاً صنعت و حرفت کے متعلم کو احکام شرعیہ متعلقہ صنعت و حرفت سے واقف ہونا چاہیے، وعلیٰ ہذا۔

(ب) سائنس و صنعت کی تعلیم کی ہمت افزائی کرنی چاہیے، اس وقت اجتماعی حیثیت سے ہمیں اس کی ضرورت ہے، فنون (آرٹس) کی افادیت ہمارے لیے نسبۃً کم ہو گئی ہے، خصوصاً ادبیات و تاریخ وغیرہ کی۔ فنون میں ان چیزوں کو ترجیح دی جائے جن میں افادیت زائد ہو، غیر مفید چیزوں میں اضاعت وقت اب خودکشی کے مرادف ہے۔

(ج) علوم و فنون کا کوئی حصہ اگر اسلامی تعلیمات سے متصادم ہوتا ہو، تو اس کی حد تک اسلامی نقطۂ نظر اور اس کی وضاحت متعلم کے سامنے کرنا ضروری ہے۔

اعلیٰ تعلیم

اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور اشخاص قیادت اعلیٰ کے منصب پر فائز ہونے کے لیے موزوں ہوں گے، ان کی تعلیم و تربیت بھی اعلیٰ پیمانہ پر ہونی چاہیے، اس تعلیم کے ذمہ داروں کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ تعلیم و قابلیت کا معیار بلند سے بلند تر ہو، خصوصاً سائنس کی تعلیم کا بہترین انتظام

ہونا چاہیے، مضامین میں اجتماعی اعتبار سے مفید و غیر مفید یا کم مفید کے درمیان خطوط امتیاز کھینچنا یہاں بھی لازم ہے، سیرت و کردار کی اہمیت اعلیٰ تعلیم میں اور بڑھائی جائے، یہ قائدین قوم اگر اسلامی کردار کے حامل، نیک سیرت اور مخلص نہ ہوئے تو قوم کی تباہی کے لیے کسی دوسرے سبب کی ضرورت نہیں ہے۔

جہاں تک دینی تعلیم کا تعلق ہے، اس کی ضرورت بدستور باقی رہتی ہے، پورے قرآن مجید سے انھیں بہرہ ور ہونا چاہیے، سیرت نبوی تفصیل سے پڑھنی چاہیے، زیادہ زور کلامی تعلیم پر ہونا چاہیے، عمومی مسائل کے علاوہ کسی مخصوص علم کے جو مسائل اس کے طالب کے سامنے آئیں اور اسلام سے متصادم محسوس ہوں تو اسلامی نقطۂ نظر کی توضیح و وجہ ترجیح سے متعلم کو پوری طرح واقف بنانا چاہیے، اگر وہ سیاسیات کا طالب علم ہے تو غیر اسلامی سیاسی نظریات کے ساتھ اسے اسلامی نظریۂ سیاست بھی جاننا چاہیے اور اس کی فوقیت سے واقف ہونا چاہیے، اگر وہ فلسفہ پڑھتا ہے تو اسلامی عقائد کا مدلل علم اسے ہونا چاہیے، غیر اسلامی اخلاقیات کے مقابلہ میں اسلامی اخلاقیات کا علم بھی لابدی ہونا چاہیے، اس مرحلے پر متعلم کو دو حقیقتوں سے پوری طرح واقف بنانا اداروں کا فرض ہے۔

اول یہ کہ علوم و فنون کے کتنے مسائل ہیں جو اسلام سے متصادم ہوتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ایسے مسائل کی تعداد بہت کم ہے، لیکن اس زہر کا تریاق مہیا نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اثرات شدید اور متعدی ہو رہے ہیں،

دوسرے یہ کہ علوم و فنون کو دین و آخرت کے لیے کس طرح مفید بنایا جا سکتا ہے، اور انھیں اسلام کا خادم بنانے کے علاوہ مہارت و قابلیت کے کس چیز کی احتیاج ہے، لیکن یہ بات اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک طالب علم کے جذبات دینی نہ ہوں، جس دل میں اللہ کا خوف نہ ہو وہ نظری بحثوں اور کلامی دلائل سے شاذ و نادر ہی فائدہ اٹھاتا ہے،

اس سلسلہ میں آخری اصولی بات یہ عرض کرنا ہے کہ دنیاوی و دینی تعلیم کے اختلافات کو مٹانے اور اسکو بلند مفید بنانے

کے لیے یہ ضروری چیز ہے کہ ہم اس خلیج کو بالکل پاٹ دیں جو ابتک دینی و دنیاوی تعلیمی اداروں میں حائل رہی ہے، دونوں قسم کے مدارس میں ایک رابطہ قائم ہونا چاہیے، اور دنیاوی اداروں کو علماے دین سے دینی رہنمائی حاصل کرنا چاہیے، اسی طریقہ سے دنیاوی مدارس کے بارے میں دینی اداروں کو دنیاوی اداروں کے فضلاء سے مستفید ہونا چاہیے، مقصد میں وحدت باہمی تعاون کی مستقل دعوت ہے،

نظام تعلیم کا مسئلہ قوم کی موت وزیست کا مسئلہ ہے، کاش ہمارے تعلیمی ادارے اور اکابر قوم ادھر توجہ کریں، اگر ہم نے اس طرف توجہ نہ کی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم دیدہ و دانستہ اپنی موت کو دعوت دے رہے ہیں، حکومت کی امداد کا مسئلہ اس راہ میں حائل ہو سکتا ہے، لیکن اگر ہم اس مشکل کو حل کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں تو وہ کوئی بڑی مشکل نہیں ہے، معیار زندگی پست کرکے، اخراجات گھٹا کر، اداروں کو خود کفیل بنا کر، غرض کسی نہ کسی طرح ہم اس دیوار کو پار کر سکتے ہیں، کیا اکابر قوم اپنی ذمہ داری کا احساس فرمائیں گے،

امام رازی

امام فخر الدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضا تھا کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے، اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس میں ان کے سوانح وحالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ فلسفہ و علم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق ان کے نظریات وخیالات کی تشریح کی گئی ہے، جو لوگ قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور وفکر کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔

(مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی)   قیمت: چھ روپے   "منیجر"

آثار علمیہ و ادبیہ

مکاتیب اقبال

بنام

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(۶۶)

بھوپال، شیش محل
یکم اگست ۱۹۳۵ء

مخدوم مکرم جناب مولانا صاحب، السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مجھے ابھی ملا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں، چند امور اور بھی دریافت طلب ہیں، اُن کے جواب[1] سے بھی ممنون فرمایئے،

۱۔ تکملۂ مجمع البحار صفحہ ۸۵ میں حضرت عائشہؓ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ حضور رسالت مآب کو خاتم النبیین کہو، لیکن یہ نہ کہو کہ ان کے بعد کوئی اور نبی نہ ہوگا،[2]

---

[1] اس وقت وہ ردّ قادیانی پر اپنا مضمون تیار کر رہے تھے [2] جی ہاں! اس کتاب میں یہ روایت ہے جو مصنف ابن شیبہ سے لی گئی ہے، لیکن اس کی سند مذکور نہیں، جو روایت کی صحت وضعف کا پتہ لگایا جائے، اور اگر صحیح ہو بھی تو یہ

(باقی حاشیہ ص ۲۲۸ پر)

مہربانی کرکے کتاب دیکھ کر یہ فرمایئے کہ آیا اس قول کے اسناد درج ہیں، اور اگر ہیں تو آپکے نزدیک ان اسناد کی حقیقت کیا ہے؟ ایسا ہی قول در منثور جلد پنجم صفحہ ۲۰۴ میں ہے، اسکی تصدیق کی بھی ضرورت ہے، میں نے یہاں بھوپال میں یہ کتب تلاش کیں، افسوس ابتک نہیں ملیں،[1]

حجج الکرامہ صفحہ ۴۲۷ - ۴۳۱ حضرت مسیحؑ کے دوبارہ آنے کے متعلق ارشاد ہے:-

"من قال بسلب نبوتہ کفر حقا" اس قول کی آپکے نزدیک کیا حقیقت ہے؟[2]

۳- "لو عاش ابراھیم لکان نبیا" اس حدیث کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، نووی اسے معتبر نہیں جانتا، ملا علی قاری کے نزدیک معتبر ہے، کیا اس کے اسناد درست ہیں؟[3] بخاری کی حدیث

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۷) حضرت عائشہؓ کی محض رائے ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار خود فرمایا ہے لا نبی بعدی، میرے بعد کوئی نبی نہیں، حضرت عائشہؓ نے اپنے خیال میں اس لیے ایسا کہنے سے منع کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے نزول کا انکار اس سے لوگ نہ سمجھنے لگیں، بہرحال یہ ان کا خیال ہے، جس کا صحیح ہونا ضروری نہیں خصوصاً ایسی صورت میں جب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہو،

[1] جی ہاں وہی، روایت بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ اس کتاب میں بھی ہے اور اسکی نسبت پہلے لکھ چکا ہوں،

[2] حجج الکرامہ فی آثار القیامہ نواب صدیق حسن خان کی کتاب ہے حضرت عیسیٰؑ کی آمد ثانی بصفت نبوت ہوگی، یا بلا صفت نبوت، اس باب میں علما کا اختلاف ہے، نواب صاحب کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ بصفت نبوت ہوگی، اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ انکے آمد ثانی میں ان کی صفت نبوت کا انکار کرتے ہیں، وہ مرتکب کلمۂ کفر ہیں، بہرحال یہ رائے ہے [3] یہ ابن ماجہ کی روایت ہے، اس روایت کو بعض محققین نے موضوعات میں شمار کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فرضاً ہے، واقعۃً نہیں، کیونکہ لو فرض اور عدم وقوع کے لیے آتا ہے، اسی سے معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، اس لیے ابراہیم بن محمد کو بچپن ہی میں اٹھا لیا گیا، چنانچہ دوسری روایتوں میں یہی مذکور ہے، چنانچہ خود ابن ماجہ میں اور بخاری میں ہے "ولو قضی ان یکون بعد محمد نبی لعاش ابنہ"

(باقی صفحہ ۲۲۹ پر)

وامامکم منکم میں واؤ حالیہ ہے کیا؟[1] اگر حالیہ ہو تو اس حدیث کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ مسیحؑ کے دوبارہ آنے سے مسلمانوں کو کوئی تعلق نہیں، کیونکہ جس وقت وہ آئیں گے مسلمانوں کا امام خود مسلمانوں میں سے ہوگا،

۵- ختم نبوت کے متعلق اور بھی اگر کوئی بات آپ کے ذہن میں ہو تو اس سے آگاہ فرمایئے،

زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ مزاج بخیر ہوگا،

والسلام

مخلص محمد اقبال

(۶۷)

بھوپال

۳۱ اگست ۱۹۳۵ء

مخدومی السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں، میں بھی یہاں حمیدیہ لائبریری اور بعض پرائیوٹ احباب سے کتابیں منگوا کر دیکھتا رہا، الحمد للہ کہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۸) ولکن لا نبی بعدہ (ابن ماجہ جنائز ـ بخاری ابنیا) یعنی یہ کہ اگر فیصلۂ الٰہی یہ ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہو تو آپکے صاحبزادہ زندہ رہتے، لیکن یہ فیصلۂ الٰہی ہو چکا تھا کہ آپکے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، ملا علی قاری نے اس کو موضوعات میں لیا ہے، اس کو معتبر نہیں کہا ہے، ضعیف کہا ہے، اس میں ابو شیبہ ابراہیم راوی ضعیف ہے، بلکہ اسکو متروک الحدیث، منکر الحدیث، باطل گو اور دروغ گو تک کہا گیا ہے، اس کے بعد بشرط صحت ملا نے اسکی تاویل کی ہے، بہرحال اس حدیث کا وہی مطلب ہے جو اس حدیث کا ہے، لو کان بعدی نبیا لکان عمر (مسند احمد و ترمذی) یعنی یہ کہ اگر میرے بعد نبی ہونا ممکن ہوتا تو عمرؓ بن خطاب نبی ہوتے، لیکن چونکہ ممکن نہیں اس لیے نہ وہ اور نہ کوئی اور نبی ہو سکتا ہے،

[1] صحیح یہی ہے کہ واؤ حالیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ عیسائیوں پر حجت ہوں گے اور مسلمانوں کی تائید فرمائیں گے، مسلمانوں کا امام الگ ہوگا، حضرت عیسیٰؑ نہ ہوں گے،

بہت سی باتیں مل گئیں، اس مطالعہ سے مجھے بے انتہا فائدہ ہوا، اور آپ کے خطوط نے اور بھی راہیں کھول دیں،

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا، اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں، اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب سمجھتا ہوں، فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی، ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں، جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے، ورنہ

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست (زبور عجم)

مخلص محمد اقبال

(۶۸)

بھوپال

۲۳ر اگست ۱۹۳۳ء

مخدوم مکرم جناب مولانا، السلام علیکم

ایک عریضہ لکھ چکا ہوں، امید کہ پہنچ کر ملاحظۂ عالی سے گذرا ہوگا،

ایک بات دریافت طلب رہ گئی تھی، جواب عرض کرتا ہوں،

کیا علماء اسلام میں کوئی ایسے بزرگ بھی گذرے ہیں جو حیات و نزول مسیح بن مریم کے منکر ہوں؟[1] یا اگر حیات کے قائل ہوں تو نزول کے منکر ہوں؟ معتزلہ کا عام طور پر اس مسئلہ میں کیا مذہب ہے؟

[1] مجھے جہاں تک علم ہے نزول مسیح کا انکار کسی نے نہیں کیا، معتزلہ کی کتابیں نہیں ملتیں جو حال معلوم ہو، البتہ ابن حزم وفات مسیح کے قائل تھے ساتھ ہی نزول کے بھی۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا، میں ۲۸ر اگست کی شام کو رخصت ہو جاؤں گا، علاج کا کورس اس روز صبح ختم ہو جائے گا، اس خط کا جواب لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیے۔ والسلام

مخلص محمد اقبال

(۶۹)

لاہور

۲ر اگست ۱۹۳۶ء

مخدومی مولانا۔ السلام علیکم

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے آپ کو صحت عطا فرمائی، آپ کا وجود ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ازبس ضروری ہے، اور مجھے یقین ہے کہ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا ہے تاکہ وہ دیر تک آپ کے علوم سے مستفیض ہوتے رہیں،

میں نے سنا ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب بدور البازغہ چھپ گئی ہے، مہربانی کر کے اس کا ایک نسخہ وی پی مجھے ارسال فرمائیے، اگر آپ کے ہاں نہیں ہے تو مہربانی کر کے جہاں دستیاب ہو سکتی ہے، وہاں سے منگوا دیجئے، یا ان کو لکھ دیجئے کہ ایک نسخہ میرے لیے وی پی کر دیا جائے، مجھے معلوم نہیں چھپی ہے، اور کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے، اس لیے آپ کو تکلیف دی گئی ہے،

موسیٰ جار اللہ کو آپ جانتے ہوں گے، انھوں نے حال میں ایک کتاب عقائد شیعہ پر شائع کی ہے، اس میں بعض لطائف ہیں جو بہت جاذب توجہ ہیں۔

والسلام

مخلص محمد اقبال

(۷۰)

لاہور

۷؍ اگست ۱۹۳۶ء

مخدومی، السلام علیکم۔ والانامہ ابھی ملا ہے، آپ کی صحت کی خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، خدا تعالیٰ آپ کو دیر تک زندہ و سلامت رکھے، میری صحت کی حالت بہ نسبت سابق بہتر ہے۔ گو آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی، انشاء اللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے، اس میں آپ کے مشورے کی ضرورت ہے، بدور البازغہ بھی اسی مطلب کے لیے منگوائی ہے، اس کتاب میں زیادہ تر قوانین اسلام پر بحث ہوگی کہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے، اس کے متعلق جو جو کتب آپ کے ذہن میں ہیں، مہربانی کر کے ان کے ناموں سے مجھے آگاہ فرمایئے، اور یہ بھی فرمایئے کہ کہاں کہاں سے دستیاب ہوں گی۔

الحمد للہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے، مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں، مگر حال کے روشن خیال علماء کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے، اگر آپ کی صحت اجازت دیدے تو آپ بھی اس پر ایک جامع و نافع بیان شائع فرمایئے، میں بھی تیسرا بیان انشاء اللہ جلد لکھوں گا۔ اس کا موضوع ہوگا بروز، لفظ بروز[1] کے متعلق اگر کوئی نکتہ آپ کے ذہن میں ہو، یا کہیں صوفیہ کی کتابوں میں اس کی بحث ہو تو اس کا پتہ دیجئے نہایت شکر گذار ہوں گا۔

موسیٰ جار اللہ[2] صاحب کی کتاب نہایت عمدہ ہے ملنے کا پتہ کتاب پر یہ لکھا ہے،

مکتبۃ الخانجی، شارع عبد العزیز، مصر

امید کہ مزاج والا بخیر و عافیت ہوگا۔ والسلام

مخلص محمد اقبال

[1] لفظ بروز کے معنی تو ظہور ہیں، مگر اس کے اصطلاحی معنی ملاحدۂ عجم کی پیداوار ہیں [2] موسیٰ جار اللہ مشہور روسی عالم و مفکر ہیں ہندوستان کئی بار آچکے ہیں، مجھ سے کہ معظمہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، یہ ترکی میں بہت سی اسلامی کتابوں کے مصنف ہیں۔

ادبیات

غزل

از

جناب جاوید انصاری برہانپوری

تذکرے حسن کے اب کون و مکاں تک پہنچے ۔۔۔ دیکھئے سلسلۂ عشق کہاں تک پہنچے

خوگر ظلم و ستم دل کو بنایا برسوں ۔۔۔ تب کہیں مرحلۂ ضبطِ فغاں تک پہنچے

عصمتِ حسن کا معصوم تقاضا ہے یہی ۔۔۔ راز الفت نہ کہیں دل سے زباں تک پہنچے

لامکاں تک ترے جلوے سے منور پایا ۔۔۔ کیا کہیں تیرے تصور میں کہاں تک پہنچے

اس قدر جذبِ محبت میں اثر پیدا کر ۔۔۔ آستاں خود تری سجدوں کے نشاں تک پہنچے

پیچ و خم راہِ طلب کے کوئی ان سے پوچھے ۔۔۔ جو ترے عشق کے اسرار نہاں تک پہنچے

کیجئے منزلِ ہستی کا تعین کیونکر ۔۔۔ کیا خبر قافلۂ عمر کہاں تک پہنچے

حسن محتاط کو اندیشۂ رسوائی ہے ۔۔۔ سر دلبر نہ حدیثِ دگراں تک پہنچے

دل ہے ناکام تمنا تو نگاہیں بدنام ۔۔۔ سعیِ تکمیل محبت میں یہاں تک پہنچے

کب تھے رنگینیِ اردو کے یہ چرچے جاوید
رفتہ رفتہ ترے انداز بیاں تک پہنچے

غزل

از

جناب ندیم مراد آبادی

بیخودی تو نہیں خودی کے قریب | تیرا جلوہ ہے زندگی کے قریب
حسن ہے چشم آگہی کے قریب | آگیا عشق زندگی کے قریب
اللہ اللہ مقام دیدۂ و دل | آگئے منزلِ خودی کے قریب
زندگی نغمہ و فغاں تو نہیں | ڈھونڈھیے کیوں غم و خوشی کے قریب
موت سے مل سکا ہے کس کو مفر | موت تو خود ہے زندگی کے قریب
آئینہ ڈھونڈھتی ہے رعنائی | محوِ حیرت ہوں میں کسی کے قریب
آج تک وہ سمجھ سکے نہ ہمیں | اک اندھیرا ہے روشنی کے قریب
دیکھنے والے خوابِ عشرت کے | غم بھی موجود ہے خوشی کے قریب

کوئی حرمانِ غم ندیم نہ تھا
یعنی جب ہم تھے زندگی کے قریب

اطلاع

پاکستان کے خریداران معارف سے گذارش ہے کہ وہ معارف کی سالانہ قیمت مکتبۃ الشرق، آرام باغ، کراچی کے پتہ سے بھیجدیں۔

منیجر

مطبوعاتِ جدیدہ

میر تقی میر از جناب ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی، ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، تقطیع بڑی، ضخامت ۳۳۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عــہ۔ پتہ: انجمن ترقی اردو ہند علی گڈھ،

اردو میں میر کے حالات اور ان کی شاعری پر مضامین کی شکل میں تو بہت لکھا گیا ہے، لیکن ان کے مرتبہ شاعری کے لحاظ سے ان پر کوئی مستقل اور مفصل کتاب نہیں تھی، لائق مصنف نے میر تقی میر لکھکر اس کمی کو پورا کیا ہے، یہ کتاب نہ صرف میر کے سوانح کی حیثیت سے بلکہ علمی و ادبی حیثیت، معلومات کے تنوع و کثرت اور تحقیق و تنقید کے لحاظ سے اردو ادب میں امتیازی درجہ رکھتی ہے، مصنف نے اس کی تالیف میں ہر ممکن الحصول ماخذ سے فائدہ اٹھایا ہے اور تلاش و تحقیق کا پورا حق ادا کیا ہے، یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں میر کے خاندانی حالات، پیدایش سے لیکر وفات تک کے سوانح اور ان کی شاعری کے عوامل و موثرات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، میر کا زمانہ تیموری حکومت کے زوال، اور سیاسی شورش و انقلاب کا دور تھا، نادر شاہ کے حملہ سے لیکر غلام قادر رہیلہ کے ہنگامہ تک مغلوں کے زوال کے سارے مراحل اور دہلی کی تباہی و بربادی کے ہولناک مناظر انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے، بلکہ خود بھی اس میں مبتلا ہوئے، جس کا اثر ان کے دل و دماغ اور شاعری پر پڑنا ناگزیر تھا، اس لیے میر کے سوانح کے سلسلہ میں اس پورے پس منظر کی مختصر سرگذشت تحریر کی گئی ہے، اس کے بعد میر کی وفات تک ان کے قیام لکھنؤ کے حالات ہیں، دوسرے باب میں میر کی سیرت، اس پر ان کے حالات کے اثرات، اور ان کے بعض بنیادی تصورات کا مختصر ذکر ہے، تیسرے باب میں میر کے کلام، ان کی غزلیات، قصائد، مثنویوں، ساقی ناموں، مراثی، واسوخت، ہجویات،

اور فارسی کلام وغیرہ جملہ اصناف سخن پر نقد و تبصرہ ہے، اس سلسلہ میں اردو شاعری میں میر کی اصلاح اور زبان کے متعلق ان کی خدمات اور اردو اور فارسی شعراء پر ان کے اثرات کا اجمالی ذکر بھی ہے، یہ باب مصنف کے ادبی و شعری مذاق پر تنقیدی بصیرت اور سخن فہمی و نکتہ سنجی کا نمونہ ہے، اس میں انھوں نے میر کے کلام کی خصوصیات اور ان کے گوناگون پہلوؤں کا اس تفصیل سے تجزیہ کیا ہے اور اس کے ظاہری و معنوی محاسن اس خوبی سے دکھائے ہیں کہ اس کا ہر رخ اور ہر پہلو نگاہ کے سامنے آجاتا ہے، اور اس کی عظمت پوری طرح نمایاں ہوجاتی ہے، اس بحث میں میر کے معائب پر بھی سرسری نگاہ ڈالی گئی ہے، چوتھے باب میں میر کی نثر کی تصانیف پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، اور اس کے بعض مفید اور دلچسپ اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، پانچویں باب میں قدیم تذکرہ نگاروں کے بیانات کی روشنی میں میر کا درجہ متعین کیا گیا ہے، اور آخر میں ضمیمہ میں میر کے متعلق بعض قدیم تذکروں کے بیانات اور بعض دوسری تحریریں نقل کی گئی ہیں، اس طرح یہ کتاب میر کے حالات اور ان کی شاعری کی انسائیکلوپیڈیا بن گئی ہے، زبان و بیان کے لحاظ سے بھی بہت دلکش و ادیبانہ اور متین و سنجیدہ ہے، غرض یہ کتاب ہر حیثیت سے اردو ادب میں ایک اہم درجہ رکھتی ہے، غالب کا فرض تو حالی، غلام رسول مہر، محمد اکرام وغیرہ بہت سے اصحاب قلم ادا کر چکے تھے، میر کا فرض باقی رہ گیا تھا، اس کو خواجہ احمد فاروقی نے بڑی خوبی سے ادا کیا ہے، ان کا یہ ادبی کارنامہ ان ترقی پسند ادیبوں کے لیے باعث تقلید ہے جنھوں نے ادب کی خدمت کا دائرہ محض تنقید اور کمیونزم کے پروپیگنڈے میں محدود کر دیا ہے، اور اس تنقید میں بھی محض دوسروں کی نقالی اور مغز و معنی کے مقابلہ میں الفاظ کا طلسم زیادہ ہوتا ہے، کاش ان کو بھی اس قسم کی ٹھوس اور سنجیدہ خدمت کی توفیق ہوتی،

مآلِ بصیرت ۔ از جناب عطاء اللہ پالوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۶۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر

قیمت مجلد: عہ؍ پتہ: سنگم کتاب گھر، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی،

یہ مصنف کے دس مضامین کا مجموعہ ہے، فدیہ، حکمت، امی، تزکیہ، مقابلہ، مسلمان، آدم، عید، مشرک،

اور اجنبی، ان مضامین میں جمہور امت کے خلاف آیات و احکام قرآنی کی بیشتر غلط اور مادی تاویلیں کی گئی ہیں، مثلاً "فدیناہ بذبح عظیم" میں فدیہ سے مینڈھے کی قربانی نہیں بلکہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش مراد ہے، "یعلمہم الکتاب والحکمۃ" میں حکمت سے مراد حدیث نبوی اور اخلاقی تعلیمات نہیں بلکہ دنیاوی علوم و فنون ہیں، امی کے معنی ان پڑھ کے نہیں بلکہ مکہ کے باشندے کے ہیں، "یتلوا علیہم آیاتنا ویزکیہم" میں تزکیہ سے نفس کا روحانی اور اخلاقی تزکیہ یا زکوٰۃ مراد نہیں، بلکہ دنیاوی ترقی کی استعداد و صلاحیت پیدا کرنا ہے، "مقابلہ" میں امریکہ اور مکہ کا موازنہ کر کے دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا مرکز کتنی پستی میں مبتلا ہے اور مادہ پرستوں کا مرکز کس قدر ترقی کر رہا ہے، "مسلمان" میں یہ دکھایا گیا ہے کہ محض عربی نام رکھ لینے، چند عقائد اور عبادات کے ظاہری رسوم ادا کرنے یا خاص قسم کی وضع قطع کا نام اسلام اور مسلمان نہیں ہے، بلکہ اسلام نام ہے سراسر ایثار و قربانی کا، اور مسلمان وہ ہے جس کا نصب العین اسلام ہو، آدم نبی نہیں تھے، نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں، استخلاف فی الارض سے مراد اخلاقی و روحانی خلافت نہیں، بلکہ دنیاوی حکومت ہے، عید روزے کے اختتام کا جشن نہیں بلکہ فتح بدر کا جشن ہے، مشرک وہ نہیں ہے جو خدا کی ذات و صفات میں شریک ٹھہرائے، بلکہ مشرک وہ ہے جو مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرتا ہے، اجنبی میں ثابت کیا گیا ہے کہ "ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینہون عن المنکر" اور اس مفہوم کی دوسری آیات میں امت سے مراد علماء و مبلغین کی جماعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پرامن تبلیغ نہیں بلکہ صاحب حکومت و اقتدار جماعت مراد ہے، جو جبر و قوت سے اس کو منوا سکے، مصنف اہل قرآن کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے پرویز اور برق وغیرہ کی طرح، اسلام اور اس کی تعلیمات کے مقاصد، اور مسلمانوں کی فوز و فلاح کے بارہ میں ان کا نقطۂ نظر بھی خالص دنیاوی یعنی مادی ترقی اور حاکمانہ غلبہ و اقتدار ہے، اس لیے مذکورۂ بالا مضامین میں اسی نقطۂ نظر سے اسلامی احکام اور قرآنی آیات کی تشریحیں کی گئی ہیں، بعض مضامین خالص علمی بھی ہیں، اور مصنف کے بعض خیالات بھی صحیح ہیں،

مگر ان کو اس بے ڈھنگے طریقے سے پیش کیا گیا ہے کہ ان سے مفید نتیجہ نکلنے کے بجائے اس کا مضر اثر مترتب ہوتا ہے، ان مضامین میں علمی بحث و تحقیق سے بہت کم زیادہ تر ملاؤں پر طعن و طنز سے کام لیا گیا ہے، اقبال کے اشعار کی مٹی بھی پلید کی گئی ہے، افسوس ہے کہ اس مختصر تبصرہ میں مضامین پر تفصیلی نگاہ ڈالنے کی گنجایش نہیں ہے، ورنہ مصنف کی تحقیقات عالیہ کے کچھ نمونے دکھائے جاتے، مگر یقین ہے کہ صاحب علم ناظرین کو موضوع بحث اور مصنف کے نقطۂ نظر سے خود اس کا کسی قدر اندازہ ہو جائیگا،

طب العرب - مترجم جناب حکیم سید علی احمد صاحب نیر واسطی تقطیع بڑی، ضخامت ۴۸۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، پتہ: ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور،

عربوں نے دوسری قوموں کے جن علوم کو اپنا کر ترقی دی ہے، ان میں ایک طب بھی ہے، انھوں نے اس کو مصر و یونان اور ایران و ہندوستان سے لیا اور اپنی تحقیقات و تجربات کے ذریعہ اس کی ہر شاخ اور ہر شعبہ کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا، اور ان ہی کے ذریعہ فن طب یورپ پہنچا اور مسلمان مصنفین کی طبی کتابوں کے لاطینی ترجمے صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہے، اس طرح طب جدید کی بنیاد درحقیقت مسلمانوں ہی کی طب ہے، پروفیسر اڈورڈ براؤن جن کو اسلامی علوم و فنون سے خاص دلچسپی ہے، لندن کے رائل کالج آف فزیشینز کی دعوت پر عربی طب پر چار لکچر دیے تھے، جو بعد میں "عربین میڈیسن" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیے گئے، طب العرب اسی کا اردو ترجمہ ہے، اس میں عربی طب کی مختصر تاریخ، طب کے پرانے اسکولوں، ان سے عربوں کے استفادہ، طب میں ان کی تحقیقات و تجربات اور اس کی مختلف شاخوں میں ان کی ترقیوں، مسلمان اطبا، ان کے کارناموں، انکی تصانیف اور ان کے لاطینی تراجم سے یورپ کے استفادہ وغیرہ، مختلف پہلوؤں سے عربوں کے طبی کارناموں پر تحقیقی نگاہ ڈالی گئی ہے، جس سے اس فن میں مسلمانوں کی ترقی کا اجمالی اندازہ ہو جاتا ہے، لائق مترجم نے مصنف کے اجمالی بیانات کی تشریح اور ان کے بعض خیالات کی تنقید و تردید میں جو فاضلانہ حواشی

لکھے ہیں، وہ بجائے خود مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان سے اس کتاب کی قدر و قیمت میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا ہے، ترجمہ نہایت سلیس شگفتہ بلکہ انشا پردازانہ ہے، یہ کتاب اپنے موضوع اور مباحث کے لحاظ سے نہ صرف اطبا بلکہ عام اصحابِ علم کے بھی مطالعہ کے لائق ہے، اور اس سے اردو کے سنجیدہ اور علمی لٹریچر میں مفید اضافہ ہوا،

خطوط غالب حصہ اول و دوم - مرتبہ جناب غلام رسول صاحب مہر، تقطیع بڑی ضخامت علی الترتیب ۴۰۸ و ۴۳۲ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ہر دو جلد عہ؎ رپتہ، کتاب منزل کشمیری بازار، لاہور،

مرزا غالب کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، مگر ان میں کوئی بھی جامع و مکمل نہیں ہے، اور وہ کسی نہ کسی حیثیت سے ناقص ہیں، ان میں سب سے زیادہ جامع مجموعہ مولوی مہیش پرشاد کا مرتب کردہ تھا، مگر اس کی ایک ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ خود مرتب کا وقت آخر ہو گیا، معلوم نہیں بقیہ جلدوں کا انجام کیا ہوا، غالب کے خطوط کی ادبی اہمیت کے لحاظ سے انکے ایک مکمل مجموعہ کی ضرورت تھی، مقام مسرت ہے کہ یہ اہم کام غلام رسول صاحب مہر مصنف غالب کے ہاتھوں انجام پایا، جو اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور مستحق تھے، یہ مجموعہ انھوں نے دو جلدوں میں مرتب کیا ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ (۱) اس میں دو مجموعوں مکاتیب غالب اور نادرات غالب کے علاوہ باقی تمام مجموعوں کے خطوط اور وہ مکاتیب بھی شامل ہیں جو مرتب کو مل سکے (۲) خطوط کی ترتیب تاریخ وار ہے، جن خطوط میں تاریخ درج نہیں تھی، ان کے اندرونی شواہد سے تاریخ کی تخمینی تعیین کی کوشش کی گئی ہے (۳) ہر مکتوب الیہ کے خطوط کے شروع میں اس کے مختصر حالات تحریر کر دیے گئے ہیں، اور حواشی میں مضمون خط کے اشارات و تلمیحات کی تشریح کر دی گئی ہے، کتاب کے شروع میں غالب کے مختصر حالات اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے، اور شعر و ادب میں ان کا درجہ واضح کیا گیا ہے، اور ان کی نثر و مکاتیب کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، اس طرح یہ مجموعہ ان تمام مجموعوں سے جو اب تک شائع ہو چکے ہیں، ہر حیثیت سے مکمل ہے،

وجیہ الدین وجدی۔ مؤلفہ جناب محمد بن عمر ایم اے لکچرار، جامعہ عثمانیہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحات،

کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، قیمت عہ، پتہ: کتاب خانہ، عابد روڈ حیدر آباد۔

وجیہ الدین وجدی بارہویں صدی ہجری کا دکھنی زبان کا بڑا ممتاز اور قادر الکلام شاعر ہے جس کا ثبوت کئی مثنویاں ہیں، مگر اس نامور شاعر کے حالات بہت کم معلوم ہیں اور قدیم تذکروں میں بھی نہیں ملتے، اس لیے مصنف نے اپنے ایم اے کے امتحان کے مقالہ کے لیے وجدی کا انتخاب کیا تھا، اور بڑی تلاش وجستجو سے اس کے حالات جمع کیے تھے، اب انھوں نے اس مقالہ کو مزید ترمیم واضافہ کے ساتھ شائع کردیا ہے، اس میں وجدی کے حالات وسوانح کے ساتھ اسکی تینوں مثنویوں پنچھی باچھا، تحفۂ عاشقان اور مخزن عشق اور اس کے کلام کی خصوصیات پر مفصل نقد وتبصرہ ہے، وجدی کے کلام کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اس کے ادبی وتاریخی پس منظر اور اس کے معاصرین کا بھی اجمالی ذکر کردیا گیا ہے جس سے اس کی حیثیت اور اہمیت پوری طرح نمایاں ہوجاتی ہے، یہ کتاب اردو شعروادب کی تاریخ میں مفید اضافہ ہے۔

تمرین الصرف۔ از جناب مولوی معین اللہ صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۹ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

صرف ونحو کی پرانی کتابوں اور ان کے طریقۂ تعلیم میں یہ بڑا نقص ہے کہ وہ محض قواعد کی علمی ونظری تعلیم تک محدود ہیں، اور انکے مطابق عربی فقرے اور عبارتیں بنانے کی مشق نہیں کرائی جاتی، اس لیے طلبہ قواعد سے تو واقف ہوجاتے ہیں لیکن ان میں عربی لکھنے اور بولنے کی استعداد پیدا نہیں ہوتی، اس لیے دار العلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ نے جدید طرز پر صرف ونحو کی ریڈریں تیار کی ہیں جن میں قواعد کے ساتھ انکی عملی مشقیں بھی ہیں جس سے قواعد بھی پوری طرح ذہن نشین ہوجاتے ہیں اور عربی لکھنے اور بولنے کی استعداد بھی پیدا ہوجاتی ہے، اس سلسلہ کی پہلی کتاب تمرین النحو اس سے پہلے شائع ہوچکی ہے، اب اسی اصول پر تمرین الصرف مرتب کی گئی ہے، یہ کتاب اپنے تعلیمی فوائد کے لحاظ سے عربی درسگاہوں کے نصاب میں شامل کرنے کے لائق ہے۔

"م"

مئی ۱۹۵۵ء

رجسٹرڈ نمبر اے ۵۳۰

سلیمان نمبر

معارف

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

مطبع معارف اعظم گڑھ